نہ قفس
نہ آشیانہ
شبنم شکیل

قفس نہ آشیانہ

(افسانوی مجموعہ)

شبنم شکیل

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

”مجھے کہنا ہے کچھ......“

تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے میں نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے۔ دل چاہتا تھا کہ ان سب واقعات کو دوسروں سے شیئر کروں مگر ان میں سے کچھ ایسے تھے کہ انہیں بیان کرنے سے ان کی بے وقعتی کا اندیشہ تھا اور کچھ ایسے کہ جن کا تقدس متقاضی تھا کہ اسے پامال نہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے بس چند واقعات کا انتخاب کیا اور انہیں افسانے کی شکل دے دی۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان واقعات میں کچھ تبدیلیاں کرنا ناگزیر تھیں اور جائز بھی۔ وہ یوں کہ میں کہانی کہہ رہی تھی عدالت کے کٹہرے میں نہیں کھڑی تھی کہ جہاں مجھے قسم کھانا پڑتی کہ سچ کہوں گی اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ تو اس مختصر سی تمہید یا ”عذرِ گناہ“ کے ساتھ یہ مختصر سا افسانوی مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔

شبنم شکیل

ترتیب

ایک سیّارے کے لوگ

چلچلاتی دھوپ میں دھول سے اٹے ہوئے کچے راستے پر دونوں سوکنیں پسینے سے شرابور چلی جا رہی تھیں۔ ہر دو منٹ بعد چھوٹی والی بڑی سے پانچ قدم پیچھے رہ جاتی اور بڑی کو رک کر اس کے ساتھ ملنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ یوں تو آگے پیچھے کا یہ سلسلہ گھر سے نکلتے ہی شروع ہو گیا تھا، لیکن آدھا راستہ طے ہونے کے بعد جب چھوٹی نے چلنے کی بجائے باقاعدہ گھسٹنا شروع کر دیا تو بڑی کا خون کھولنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ چھوٹی کی پیٹھ میں دو دھموکے لگائے اور اسے وہیں چھوڑ کر خود اکیلی درگاہ شریف چلی جائے۔ وہ اکیلی ہوتی تو اب تک کب کی درگاہ پہنچ چکی ہوتی۔ کس مشکل سے تو اس نے اتنی گرمی میں اپنے آپ کو پانچ میل پیدل چلنے پر تیار کیا تھا۔ اسے کئی روز سے باری کا بخار آ رہا تھا اور بہت کمزوری محسوس ہوتی تھی، لیکن آج ماسٹر کی اپیل کا فیصلہ تھا اور اب ''سائیں کاواں والے'' کی مدد مانگنا ضروری ہو گیا تھا۔ ماسٹر امتحان میں لڑکوں کو نقل کراتا ہوا پکڑا گیا تھا اور معطل کر دیا گیا تھا۔ دو ماہ سے اس کی تنخواہ بھی بند تھی اور گھر پہ پیغمبری وقت آن پڑا تھا۔ چھوٹی نے صبح صبح آج یہ سنا دی بھی دی تھی کہ گوالے نے بچے کے لیے دودھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ پچھلے پیسے مانگ رہا ہے۔

چھوٹی کے بچے کا خیال آتے ہی آگ کا ایک گولا اس کے پیٹ میں اُٹھا اور چکر لگاتا ہوا سر تک پہنچ گیا۔ آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کا ایک ریلا سا نکل کر خود بخود اس کے گالوں پر بہنے لگا۔ ''اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو اسے بانجھ بنا دیا گیا۔ بانجھ نہ ہوتی تو ماسٹر دوسری شادی کیوں کرتا۔'' بڑی نے اپنی میلی چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے دل میں کہا ''فکر نہ کر وہ تمہاری نوکرانی بن کر رہے گی۔ کیوں رو رو کر جان کھپاتی ہو۔'' ماسٹر نے دوسرے نکاح سے پہلے اسے تسلی دی تھی۔ ''نیک بخت ایک بیٹا ہو جائے تو تمہاری میری نسل آگے چلے۔ اس کے بعد اگر اسے ہاتھ لگاؤں تو حرام کروں۔'' جس دن چھوٹی کا ڈولا صحن میں اترا تھا۔ ماسٹر نے اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر کئی قسمیں کھائی تھیں۔ ہاں اتنی بات تو سچ نکلی کہ چھوٹی ہمیشہ گھر میں نوکرانی بن کر رہی۔ یتیمی اور غربت نے اسے پہلے ہی سے سب کچھ سہنا سکھا دیا تھا۔

گھر کا سارا کام کاج اُسی کے ذمے تھا۔ پھر وہ شرم لحاظ والی بھی تھی۔ کاکا سال کا ہو گیا تھا، لیکن وہ ابھی تک ماسٹر کے سامنے گھونگھٹ نکال کر آتی تھی۔ بڑی کے سامنے وہ کبھی ماسٹر کے ساتھ ایک چارپائی پر بھی نہ بیٹھی تھی۔ یوں بھی بیٹا پیدا ہونے کے بعد بڑی نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اب اس کا تعلق ماسٹر کے ساتھ ختم ہوا۔ ''رات کو اپنی کوٹھری کی کنڈی لگا کر سویا کرو...... کوئی ایسی ویسی بات دیکھی تو بچہ چھین کر واپس میکے بھیج دی جاؤ گی'' ...... چھوٹی ان ہدایات پر عمل بھی کر رہی تھی۔ بچہ چھیننے کی دھمکی نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ جیسے ہی ماسٹر گھر پر قدم رکھتا...... وہ بھاگ کر اپنی کوٹھری میں چھپ جایا کرتی تھی۔ پر ان ساری حفاظتی تدابیر کے باوجود بڑی اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ بہت اکیلا محسوس کرتی۔ اسے ایسا لگتا جیسے کسی آگ کی بھٹی پر چنوں کی طرح بھونی جا رہی ہے اور کوئی اسے نکالنے نہیں آتا۔ بھنے ہوئے چنوں کی بات سوچ کر ساتھ ہی اسے

خیال آیا کہ آج صبح اس نے صرف ذرا سے ستو گھول کر پیئے تھے۔ اس کا جی بہت ماندہ تھا اور کچھ کھانے کو نہ چاہتا تھا۔ البتہ چھوٹی چنگیر سامنے رکھ کر روٹیوں پر روٹیاں ہڑپ کر رہی تھی۔ بڑی کے دل پر تیر سا لگا، وہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر چھوٹی کو مخاطب کیا۔ ''صبح کتنی روٹیاں کھائی تھیں تم نے؟...... چھ...... اب ان کو حلال بھی کرو اور ذرا تیز چلو......'' گھر والوں نے رزق حلال کرنا بھی سکھایا ہے یا نہیں......؟ چھوٹی گھبرا کر بھاگی تو بڑی نے غور کیا کہ بھاگنے میں اس کے پاؤں بہت ٹیڑھے پڑ رہے تھے۔ رنگ ہلدی ہوا جا رہا تھا اور اسے بری طرح سے سانس چڑھی ہوئی تھی۔ وہ قریب آئی تو بڑی کو اس کے چہرے کی چھائیاں اور آنکھوں کے حلقے بہت نمایاں نظر آنے۔ ابھی وہ چھوٹی کی ہیئت پر غور ہی کر رہی تھی کہ اس نے درخت کے ایک تنے کو پکڑ کر سہارا لیا اور قے کرنے لگی۔ قے کرتے ہوئے اس کے سارے جسم سے پسینہ پھوٹ بہا اور ہاتھوں کی رگیں زیادہ گہری ہو گئیں۔ اس نے سنبھل کر سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی تو اس کی ٹانگیں بری طرح کانپیں۔ اس واقعے کو ٹالنے کے لیے چھوٹی نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی، مگر اس مسکراہٹ نے اس کے چہرے کو پہلے سے بھی زیادہ بے رونق بنا دیا اور جب بڑی نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی تو وہ کھسیانی سی ہو کر اپنی چادر کی بُکل ٹھیک کرنے لگی، مگر اب معاملہ بالکل صاف ہو چکا تھا۔ بڑی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ایسا مروڑا کہ چھوٹی تکلیف سے دوہری ہو گئی۔

''یہیں بیٹھ جا۔'' ماپے کھادئی''...... تیری خبر لیتی ہوں۔ سچ سچ بتا دے کتنے دن چڑھے ہیں''...... بڑی نے اسی طرح اس کا ہاتھ مروڑتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ چھوٹی کا رنگ یہ سوال سن کر مٹی جیسا ہو گیا...... اس نے پچی سی آواز میں کہا...... ''آپا جی میں بے قصور ہوں''...... آپ ماسٹر جی سے پوچھ

لیں میں نے تو بڑی منتیں کی تھیں‘ پر انہوں نے زبردستی کی۔“

”تو نے کنڈی کیوں کھولی تھی حرام زادی۔“ بڑی نے اسے دو ہتڑ مارتے ہوئے پوچھا...... ”کنڈی نہیں کھولی آپا جی۔ پچھلے مہینے جب آپ شیخوں کے گھر میلاد پر گئی تھیں تو ماسٹر جی آپ کو وہاں چھوڑ کر گھر آ گئے تھے......“ چھوٹی نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔ بڑی نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور چپ رہی...... ”میں نے جیراں دائی سے دوا منگوا کر بھی کھائی تھی جی پر کچھ بنا نہیں۔ میری قسمت ہی خراب ہے۔“ چھوٹی نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا......

”گھر واپس چل۔“ ”آج تیری خیر نہیں۔ اب ہم درگاہ نہیں جائیں گے۔“

بڑی نے فیصلہ کن لہجے میں حکم دیا۔

چھوٹی نے دھم سے زمین پر گر کر بڑی کے پاؤں پکڑ لیے......

”معاف کر دیں آپا جی...... معاف کر دیں۔ آپ کو نبی کریم کا واسطہ۔ آپ کو سائیں کاواں والے کا واسطہ۔ آپ مجھے یہیں مار لیں جتنا مارنا ہے پر اب خالی ہاتھ گھر نہ جائیں۔ درگاہ پر چادر چڑھا کر واپس چلیں جی۔ گھر میں کھانے کا بھی آسرا نہیں ہے۔ ماسٹر جی کی نوکری......“

”بڑی فکر ہے تجھے ماسٹر کی نوکری کی۔ ویراں کھا دی۔“ بڑی نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”چولہے میں گیا ماسٹر اور چولہے میں گئی اس کی نوکری۔ بھوکے مرو گے تم دونوں تُو اور تیرا بچہ۔ مجھ اکیلی ذات کو دو روٹیاں دینے والے بہت۔ بس اب گھر پہنچ۔ آج فیصلہ ہو گا یا تُو نہیں یا میں نہیں۔“

”آپا جی میں ہی نہیں۔ آپ تو مالک ہیں گھر کی“...... چھوٹی گھگھیائی اور گھر کے راستے پر چل پڑی۔

گھر پہنچ کر بڑی نے چھوٹی کو تو شاید دو چار ہاتھ ہی مارے‘ مگر خود کو پیٹ پیٹ کر نیلا کر لیا۔ جب سینہ کوٹتے کوٹتے تھک گئی تو پاؤں سے جوتی اتار کر

اپنے سر پر گن گن کر مارنے لگی۔ چھوٹی ہاتھ سے جوتی پکڑنے آئی تو دو چار اس کے بھی لگیں۔

شام تک دونوں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ چھوٹی نے ایک دو مرتبہ اُٹھ کر بچے کو چاول کھلائے‘ مگر بڑی اسی طرح مردوں کی طرح چارپائی پر پڑی رہی۔ جب ماسٹر گھر میں داخل ہوا تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

ماسٹر کو اندر آتا دیکھ کر چھوٹی تیر کی طرح بھاگی اور کوٹھری میں بند ہو گئی...... ”چڑھا آئیں چادر“...... ماسٹر نے چارپائی پر بڑی کے قریب بیٹھے ہوئے پوچھا...... ”نہیں چڑھائی“...... بڑی نے منہ سر لپیٹتے ہوئے جواب دیا ”اپنی میت کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔“

ماسٹر نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی پھر اس کا سوجا ہوا چہرہ اور سرخ آنکھیں دیکھ کر بولا...... ”کیا ہوا پھر جھگڑا ہوا دونوں میں۔ بیزار ہو گیا میں اس روز روز کے جھگڑے سے۔ اب بک جلدی سے بات کیا ہوئی ہے۔“ ”وہ مرتے مرجائے گی پر تیرا جلاپا ختم نہیں ہو گا۔“

بڑی یہ بات سُن کر جھپٹ کر اُٹھی اور ماسٹر کا گریبان پکڑ کر بولی۔

”یہ روز والا جھگڑا نہیں ہے ماسٹر...... آج فیصلہ ہو گا۔ ابھی اس وقت اس کو میکے چھوڑ کر آ۔ نہیں یا میں مرجاؤں گی یا اسے مار ڈالوں گی۔“

ماسٹر نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا گریبان چھڑایا اور غصے سے بولا۔ صبح سے بھوکا پیاسا مارا مارا پھر رہا ہوں۔ تجھے نہ میری فکر ہے نہ میری نوکری کی۔ اپنی عدالت لے کر بیٹھ گئی ہے۔ اُٹھ کھانا دے مجھے نماز کو دیر ہو رہی ہے۔

”تیری نمازیں کسی کام نہیں آئیں گی ماسٹر“...... بڑی چیخی...... تیرا تو جنازہ بھی خراب ہو گا۔ اللہ کے قہر سے ڈر‘ اتنا جھوٹ‘ اتنی وعدہ خلافی‘ اتنا فریب

میرے ساتھ۔ تو نے تو کہا تھا بچے کے بعد اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ پھر اس کے پیٹ میں بچہ کس کا ہے؟ کیوں گیا تو اس کے پاس......بتا......بتا......بتا......"

بڑی نے ماسٹر کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

ماسٹر اس غیر متوقع حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا......"بس ایک دفعہ غلطی ہوئی تھی اب مجھے کیا پتہ تھا کہ کُتیا کو اس میں پیٹ ہو جائے گا۔ میں تو تھوکتا بھی نہ اس پر کبھی۔"

"اچھا۔ صبر کر صبر کر۔ صبر کا حکم دیا ہے اللہ نے۔ اُٹھ ہاتھ منہ دھو اور میرے لیے کھانا لا۔" ماسٹر نے خوشامد سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

بڑی اس خوشامدانہ لہجے سے ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گئی۔ "نہیں ماسٹر اسے چھوڑ کر آ میں یہ حرام کاری نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے فیصلہ سنایا۔

اب بات ماسٹر کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس نے بڑی کی چوٹی پکڑ کر اسے دو تین زوردار جھٹکے دیئے اور بولا......نکاح کیا ہے میں نے بڈھی ڈائن حرام نہیں کیا۔ کفر بولتی ہے......زبان کھینچ لوں گا ابھی۔" بڑی نے ایک دلدوز چیخ مار کر ہائے کا نعرہ بلند کیا تو ماسٹر نے اس کے ایک لات رسید کی اور چارپائی سے نیچے گرا دیا۔ چیخ پکار کی آواز سن کر چھوٹی سہمی ہوئی کوٹھری سے باہر نکلی اور بڑی کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھی' مگر ماسٹر کی ایک لات کھانے کے بعد اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ "میری نظروں سے دور ہو جا کتیا۔" ماسٹر نے چھوٹی کو مخاطب کیا "جہنم بنا دیا ہے گھر کو۔" اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے۔ "کھانا گرم کر میرا۔ صبح سے بھوکا ہوں۔"

چھوٹی جب روٹی پکا کر لائی تو بڑی ابھی تک زمین پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ ماسٹر نماز پڑھنے کے لیے چلا گیا تو اس نے ذرا جرأت کی۔ اندر سے بچے کو اٹھا کر لائی اور اسے بڑی کے پاؤں پر بٹھا دیا۔

"کاکا' آپا جی سے کہو ہمیں معاف کر دیں۔" وہ بچے سے مخاطب ہوئی۔ تو معصوم ہے کاکا میری طرح گناہ گار نہیں ہے' آپا جی تیری بات نہیں ٹالیں گی۔ انہیں بتا میرا کوئی نہیں اس دنیا میں" جب ماں باپ مر گئے تو میکہ کون سا رہ گیا۔" اس کی آواز بھرا گئی۔" کاکا۔ بھائی اور بھرجائی مجھے نہیں رکھیں گے۔ یتیم ہوں۔ غریب ہوں۔ بے آسرا ہوں کاکا میری سفارش کر دے آپا جی کے آگے۔" چھوٹی نے اپنے ٹیالے چہرے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

بڑی نے اپنے چہرے سے چادر ہٹائی اور خالی خالی نگاہوں سے چھوٹی کو دیکھا۔ چھوٹی نے موقع غنیمت جانا اور بڑی کے پاؤں پکڑ لیے۔" تابعدار ہوں آپ کی......نوکر ہوں......غلام ہوں......"اس نے التجا کی۔

"مجھے یہیں پڑا رہنے دیں......" بڑی چپ رہی......" روٹی لاؤں آپ کے لیے......صبح سے بھوکی ہیں۔ بخار بھی ہے۔" چھوٹی نے پیار سے کہا۔

بڑی اٹھ کر بیٹھ گئی......" جا لے آ روٹی......زہر مار کر لوں"......اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ چھوٹی یہ حکم سن کر تیزی سے اٹھی اور چکرا کر دیوار سے ٹکرائی......" چکرا آ گیا تھا"......وہ دیوار کو تھامے تھامے شرمندگی سے ہنسی۔

"تو بھی تو صبح سے بھوکی ہے......" بڑی نے افسوس کے ساتھ سر ہلاتے ہوئے کہا......" اپنی روٹی پر گھی لگا لے ذرا سا"......تیری حالت میں تو عورت کو طاقتور غذا چاہیے۔ پرچھتی والے کنستر سے گُڑ کی دو ڈلیاں بھی لے لے۔ ماسٹر کی نوکری ٹھیک ہو جائے تو دودھ والے سے ایک پاؤ دودھ تیرے لیے بھی لے لیا کریں گے۔" میرا کیا ہے......میں اوتری نکھتری......نہ بال نہ بچہ......بڑی کی آنکھوں میں پھر آنسو آئے۔

لال دیدی

''میں لال دیدی نہیں بن سکتی' یہ بات تو طے ہے'' عطیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ بات میری مٹی میں نہیں ہے کہ چپ چاپ ظلم سہتی رہوں اور احتجاج نہ کروں' صبح سے لے کر شام تک میری عزتِ نفس کو مجروح کیا جاتا ہے۔ مجھ سے توقع رکھی جاتی ہے کہ ہر بکواس کے جواب میں جی ہاں جی ہاں کہتی رہوں اور پھر رات کو ایک ستی ساوتری کی طرح پھولوں کی سیج سجا کر ایس۔ایم۔ نصیر صاحب چیف اکاؤنٹنٹ کے بیڈروم میں پدھارنے کا انتظار کروں' نہیں نہیں' مجھ سے یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے شبنم کہ الگ ہوجاؤں گی نصیر سے۔ تمہیں پتہ ہے مجھے یہ سب کچھ برداشت کرتے ہوئے آج دس سال آٹھ مہینے اور پانچ دن ہوگئے ہیں۔

"But no more This LAL DIDI Business"

اس نے آنکھوں میں آئے ہوئے موٹے موٹے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے منہ دوسری طرف کرلیا۔

''لال دیدی کون ہے عطیہ؟'' میں نے اس کی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا جنہیں میں بھی پچھلے دس سال آٹھ مہینے اور پانچ دن سے سُن رہی تھی۔

''تھا ایک ہندو لڑکی کا کردار' میری ماں کا آئیڈیل' بچپن میں روز مجھے یہ کہانی سنایا کرتی تھیں' بیٹا اس کہانی سے سبق سیکھ۔'' عطیہ نے اپنی ماں کے لب و لہجے کی نقل اتارتے ہوئے طنزیہ کہا۔

''کسی صابر وشاکر لڑکی کی کہانی۔'' میں نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔'' عطیہ نے تمسخرانہ انداز میں جواب دیا۔

''کیا کہانی تھی؟ مجھے بھی سناؤ نا۔'' میں نے ایک ماہر سراغ رساں کی طرح اس کے دل میں چھپے ہوئے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کی۔

اس نے کافی کا گھونٹ پیے بغیر پیالی میز پر واپس رکھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''شبنم صاحبہ ایک بات کا اقرار تو آپ بھی فرمائیں گی کہ میرا اتفاق سے سائیکالوجی سے تحقیقی سرگرمیوں کی حد تک گہرا تعلق ہے۔''

''بالکل بالکل۔'' میں نے فوراً تائید کی۔

''تو اگر تمہارا خیال ہے کہ لال دیدی کے کردار کے ذریعے تم میری تحلیل نفسی کرو گی اور اس طرح میرے تحت الشعور میں چھپے ہوئے کومپلیکسز کو سامنے لاسکو گی تو تمہارا خیال بالکل...... صحیح ہے۔ عطیہ نے آنسوؤں بھرا قہقہہ لگایا۔ اس لیے میں تمہیں یہ کہانی ہرگز نہیں سناؤں گی۔''

فون کی گھنٹی بجی' عطیہ نے ریسیور اٹھایا۔ لارنس کالج گھوڑا گلی سے اس کے بیٹے عرفان کا فون تھا۔ میں باہر ٹیرس پر آ گئی۔

''عرفان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بہت تیز بخار ہے اسے۔'' میں واپس اندر آئی تو اس نے مجھے بتایا۔ وہ بہت متفکر معلوم ہو رہی تھی۔ ''رو رہا تھا میرا بیٹا۔'' کہتا تھا مجھے فوراً آ کر لے جائیں۔

''تو لے آؤ نا۔'' میں نے کہا۔

''نصیر نہیں لانے دے گا۔'' وہ کہتا ہے کہ بچوں کو رف اینڈ ٹف ہونا چاہیے۔ بہت جھگڑا کرے گا اور ابھی تو صبح کی لڑائی......

''ویسے تو بہت خیال رکھتے ہوں گے وہاں بچوں کا آخر اتنا نامور ادارہ ہے۔ علاج بھی ہو رہا ہوگا۔ فکر نہ کرو۔'' میں نے عطیہ کو تسلی دینے کے لیے اور میاں بیوی کے ایک اور متوقع جھگڑے کے خیال سے کہا۔

''ہاں بہت خیال رکھتے ہیں وہاں بچوں کا' تم بھی اپنے بچے اس نامور ادارے میں رکھوا دو' تمہارے تو تین ہیں۔ میرا تو اکلوتا بیٹا ہے۔'' اس نے پھر طنز کیا۔

''میں نصیر بھائی سے بات کروں گی عرفان کی۔'' میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

''ضرور کرنا اور پھر ایک لمبا لیکچر سننے کے لیے تیار رہنا چیف اکاؤنٹس ایس۔ایم......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پورچ میں ہونڈا سوک کا ہارن سنائی دیا۔

''یہ آج اتنی جلدی کیسے آ گیا۔'' عطیہ نے تیوری چڑھائی۔

''میں چلتی ہوں۔'' میں جلدی سے اٹھی۔ ''بچے کھانے پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے' ڈیڑھ بج گیا ہے۔'' میں نے ساری سچوایشن سے بچنے کا راستہ تلاش کیا۔

''ابھی تو کہہ رہی تھیں...... نصیر سے بات کروں گی' اب بھاگنے لگی ہو۔'' عطیہ نے ذرا تیز لہجے میں کہا' ''شبنم ایک مہربانی کرتی جاؤ تم ذرا اسے عرفان کا بتاؤ' میری تو صبح سے بول چال بند ہے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

''کیسی ہیں بھابی آپ؟ ہماری بیگم کہاں ہیں اور اب ان کا موڈ کیسا ہے۔'' نصیر بھائی نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا۔

''کیا خراب تھا موڈ؟'' میں نے انجان بن کر کہا۔ ''وہ تو شاید اپنے کمرے میں گئی ہے کام سے۔''

''اسے سمجھائیں بھابی پاگل ہے بالکل آپ کی سہیلی۔'' وہ بات کرنے کے موڈ میں تھے اور میری گھر جانے کی کوشش ناکام ہوتی نظر آ رہی تھی۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے حیرانی کی ایکٹنگ کی۔

''ایسی احمقانہ باتوں پر جھگڑا کرتی ہے کہ حیران رہ جاتا ہوں' ابھی شاید اس نے آپ کو تازہ ترین معرکے کی تفصیلات نہیں بتائیں' ٹریجڈی یہ ہے صاحب کہ ہمارے گھر میں لڑائی ہمیشہ دوسرے لوگوں کی وجہ سے ہوتی ہے' ہے نا بچگانہ پن۔''

''نصیر بھائی لڑائی تو سب میاں بیوی میں ہوتی ہے' نارمل سی چیز ہے۔'' میں نے حالیہ قصے کو غیر اہم بنانے کی کوشش کی۔

''مگر کوئی معقول وجہ تو ہو۔'' وہ ذرا غصے میں آ گئے۔ ''اب دیکھئے صبح عطیہ کے ماموں پر جھگڑا ہوا۔ موصوف یہاں واپڈا میں کلرک ہیں۔ ان کی گوجرانوالہ ٹرانسفر ہوگئی تھی۔ جو روٹین میں ہو جایا کرتی ہے۔ موصوف جانا نہیں چاہتے تھے۔ عطیہ نے مجھ سے کہا' رکوائیں ان کی ٹرانسفر......''

''تو رکوائی آپ نے؟'' میں نے جان بوجھ کر ان کی بات کاٹی۔

''اس کی نوبت ہی کہاں آنے دی انہوں نے جا کر چیف انجینئر سے ملے' مجھ سے عزیز داری انہیں سمجھائی اور کہا وہ میری ٹرانسفر رکوانے کی کوشش کر رہے ہیں' ابھی مجھے Relieve نہ کیجئے۔'' چیف انجینئر نے مجھے فون کیا۔ میں نے کہا صاحب اگر کوئی میری بیگم کا ماموں بن کر آ جائے تو یقین نہ کر لیا کریں فوراً اب بھابی آپ انصاف کریں۔ یہ زیادتی ہے یا نہیں۔ جب کہ میں نے عطیہ کو بہت واضح الفاظ میں ہدایات دے رکھی ہیں کہ وہ اپنے رشتے داروں کو

میرا نام استعمال کرنے کی اجازت نہ دے' میں تو انہیں حماقتوں کی وجہ سے اس کا اپنے گھر والوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"بہت پریشان رہے ہوں گے بیچارے' اس لیے آپ کا نام لے دیا۔ حاجت مند تو دیوانہ ہوتا ہے۔" میں نے صفائی پیش کی۔

"جی ہاں' دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔" نصیر بھائی نے جواب دیا۔ "قصہ دراصل یہ ہے بھابی کہ عطیہ کا فیملی بیک گراؤنڈ ہے بہت ہمبل (Humble) اور مسئلے اس طرح کھڑے ہوتے ہیں کہ یہ ابھی تک اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ Identify کرتی ہے' بہرحال آپ تو جانتی ہی ہیں سارے حالات..... بس اسے اتنا سمجھا ئیں کہ کم از کم میرے Status کا خیال.....

"نصیر بھائی' عرفان کی طبیعت بہت خراب ہے' عطیہ اسے تھوڑے دنوں کے لیے گھر لانا چاہتی ہے' بہت پریشان ہے' اسے مرضی جانے دیں۔" میں نے پھر ان کی بات کاٹی۔

"عرفان کو معمولی سا فلو ہے۔ میری آج صبح پرنسپل سے بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر برابر اسے دیکھ رہا ہے۔ آخر بچہ ان کی ذمے داری ہے' Pay کرتے ہیں ہم ہر چیز کے لیے' یہ بچے کو بگاڑنے والی بات ہوئی نا کہ جیسے ہی اس نے ضد کی ماں باپ نے ہتھیار ڈال دیئے۔"

وہ ناصحانہ انداز میں بولے۔

"دراصل مائیں بیچاری"..... میں نے کوئی دلیل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"سب مائیں نہیں بھابی۔" انہوں نے بہت حتمی انداز میں کہا۔ "میں اپنے کولیگز کی بیویوں کو دیکھتا ہوں بہت ریزن ایبل ہیں اولاد کے معاملے میں' مگر عطیہ اس مڈل کلاس اموشنل ازم سے کبھی باہر نہیں آ سکتی' خیر چھوڑیئے اس

بحث کو' آپ سے بات کر کے دل ذرا ہلکا ہو گیا۔ آپ کہتی ہیں تو بلوا لیتا ہوں عرفان کو' مگر عطیہ کو جانے کی ضرورت نہیں ڈرائیور لے آئے گا جا کر' اچھا اب ذرا اپنی سہیلی کو کمرے سے نکال کر لائیں' اسے ایک خوشخبری بھی سنائیے گا۔ ہم لوگ پندرہ دن کے لیے لندن جا رہے ہیں' سیمینار ہے ایک وہاں' یہ شاپنگ کرے گی لندن میں۔"

فون کی گھنٹی بجی۔ "ارے کب آئیں تم لندن سے؟" میں نے عطیہ کی آواز سن کر خوشی سے کہا۔ "کہاں کہاں گھومیں؟ ابھی گھر پر ہی ہو' میں تمہاری شاپنگ دیکھنا چاہتی تھی۔"

"میں نے نصیر کا گھر چھوڑ دیا ہے۔" اس کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی' میں چونکی۔ "تو کہاں سے بول رہی ہو؟"

"یہاں کرشن نگر میں ایک ڈاکٹر کی دکان سے بول رہی ہوں۔ یہ کوئی ڈاکٹر فتح محمد ہیں۔ چائلڈ اسپیشلسٹ۔ ان کی ساتھ والی گلی میں میری باجی کا گھر ہے وہیں آ گئی ہوں۔"

"پورا پتہ سمجھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

عطیہ نے گلی اور مکان کا نمبر بتایا۔

کرشن نگر کی ایک تنگ سی گلی کے ایک پرانے مکان پر عطیہ کے بہنوئی کے نام کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھلا تھا میں اندر داخل ہوئی۔ عطیہ کی شکل و صورت کی ایک خاتون صحن میں لگے نلکے پر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھے اور کھڑی ہو گئیں۔

"سامنے والے کمرے میں ہے آپ کی سہیلی۔" انہوں نے ہاتھ سے

اشارہ کیا۔ "یہاں صبح سے بجلی غائب ہے گرمی اور اندھیرے میں بیٹھی ہے۔ میں صحن میں کرسیاں نکلوا دیتی ہوں باہر لے آئیں اسے۔"

ملگجے سے سرخ رنگ کی دری کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس بچھی تھی اور عطیہ اس پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کی بہن کے دونوں بچے اس کے پاس بیٹھے شاید اپنا ہوم ورک کر رہے تھے۔

"تو آخر تم نے فیصلہ کر ہی لیا" میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ "کیا بہت سیریس بات ہوگئی تھی کوئی؟"

"حد ہوگئی تھی' لندن میں اس شخص نے میری ذلت کی انتہا کر دی' میں نے وہیں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔"

"پوری بات بتاؤ۔" میں نے پہلی مرتبہ اس کے معاملے میں سنجیدگی سے دخل اندازی کی۔

نصیر کے ایک دوست کے گھر ٹھہرے تھے ہم وہاں فارن سروس میں ہیں' وہ نصیر سارا دن اس کی بیوی سے میرا متابلہ کرتے رہتے تھے۔ بہت زیادہ متاثر ہو گئے تھے ان کی بیگم صاحبہ سے' اٹھتے بیٹھتے مجھے یہی مشورہ دیا جاتا تھا کہ میں ان سے زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھوں۔ یقین کرو میری ایسی تذلیل......

عطیہ نے مجروح نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کیا بہت توپ چیز تھیں وہ؟" میں نے پوچھا۔

"خاک۔" عطیہ نے حقارت سے کہا "بس ایسے ہی تھیں جیسی ہمارے ہاں کی اکثر بیگمات ہوتی ہیں۔ وہی کٹے ہوئے بال' وہی تصنع کے بوجھ سے کراہتا ہوا انداز' وہی انگریزی لہجہ اور سطحی قسم کی گفتگو' کسی فیڈرل سیکرٹری کی بیٹی ہے' ڈولی ہے نام' مگر دونوں ایک دوسرے کو چندا اور جانی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"بھئی پنچ لائن (Punch Line) کیا تھی' پورے قصے میں' مجھے

تجسس ہوا' کوئی فلرٹیشن وغیرہ کا چکر تو نہیں تھا دونوں میں۔"

نہیں ایسا کوئی چکر نہیں تھا' عطیہ نے بہت یقین سے کہا' "سچ پوچھو تو پنچ لائن بھی کوئی نہیں ساری کہانی میں' بس ایسے ہے شبنم کہ آپ کسی چیز کو ایک خاص حد تک سہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد بریکنگ پوائنٹ آ جاتا ہے اس کا' اب وہ آ گیا تھا میرے اور نصیر کے تعلقات میں' عطیہ کی آواز رندھ گئی۔" وہاں ایک دن کھانے پر بیٹھے تو میرے شوہر نامدار بہت چہک رہے تھے' فرمانے لگے' ڈولی بھابی آپ لوگوں کے ہاں آ کر طبیعت خوش ہوگئی ہے میری' ایک فضا ہے آپ کے ہاں' ٹھنڈی ٹھنڈی' کسی اموشنل کرائسس کی گنجائش ہی نہیں اس میں' دراصل آپ دونوں میاں بیوی ایک ہی پیڈسٹل پر ہیں نا' اسی لیے اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے آپ میں' مگر بھابی میں تو اس کا سارا کریڈٹ آپ ہی کو دوں گا۔ بس ایک نوازش مجھ پر بھی کر دیں۔ میری بیوی کو بھی اپنے جیسا بنا دیں۔ اسے خوامخواہ کے جذباتی پن سے نکالیں۔" شبنم یقین کرو میرا دل ڈوب مرنے کو چاہا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اب الگ ہو جاؤں گی۔ عطیہ نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔

"نصیر نے رابطہ کیا ہے تم سے۔" میں نے پوچھا۔

"نصیر تو لندن سے واپسی پر کراچی رک گئے تھے' کوئی کام تھا انہیں' میں اکیلی پہنچی ہوں کل لاہور۔ آج صبح اپنے دو سوٹ کیس اٹھائے اور یہاں آ گئی باجی کے پاس۔"

میں نے سوالیہ نظروں سے عطیہ کی طرف دیکھا۔

"میں شادی سے پہلے والی سروس جوائن کرلوں گی' ان لوگوں پر بوجھ تھوڑا ہی بنوں گی۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی" مگر میں رہوں گی یہیں۔" اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"میرے بہنوئی بہت نیک آدمی ہیں، بہت تسلیاں دے رہے تھے مجھے
سچ میری باجی کی گھر میں بہت عزت ہے۔" عطیہ بڑی دیر تک اپنے بہن بہنوئی
کی محبت بھری زندگی کا تذکرہ کرتی رہی۔

"میں چلتی ہوں۔" میں نے باہر اندھیرا گہرا ہوتے دیکھ کر کہا۔ "کل
صبح گاڑی بھیجوں گی تمہیں لینے کے لیے میرے پاس رہنا سارا دن۔"

دوسرے دن ڈرائیور عطیہ کو لینے گیا۔

"بیگم صاحبہ تو بہت صبح اپنے گھر واپس چلی گئیں ان کی ہمشیرہ نے بتایا
ہے۔" اس نے واپس آ کر کہا۔

"تو چلو مجھے نصیر صاحب کے ہاں لے چلو۔" میں نے ڈرائیور سے
کہا۔

عطیہ کے بیڈروم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی، مگر
شاید ایئر کنڈیشنر کے شور میں اسے میری دستک سنائی نہیں دی۔ میں نے ناب
گھمایا، وہ لاکڈ نہیں تھا۔ عطیہ اپنے بیڈ پر بے سدھ سو رہی تھی۔ میں ایک صوفے
پر بیٹھ کر اس کے جاگنے کا انتظار کرنے لگی۔ اس کی آنکھ ملازم کے دروازہ
کھٹکھٹانے پر کھلی جو اس کے لیے جوس کا گلاس لے کر آیا تھا۔

"تم کب آئیں؟ مجھے جگایا کیوں نہیں۔ باجی کے ہاں گئی تھیں۔
وہیں سے پتہ چلا ہوگا۔" اس نے سب ایک ساتھ کہا۔

"باجی سے ہی پتہ چلا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"شبنم یقین کرو۔ میں کل پوری رات جاگتی رہی ہوں، ایک لمحے کے
لیے جو آنکھ لگی ہو۔ اتنی گرمی تھی وہاں کہ تم اندازہ نہیں کر سکتیں...... اور پھر......
اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔"

"وہاں ٹریفک کا شور بھی سنائی دیتا ہے۔ ذرا میری شکل دیکھو۔ ایک
رات میں میری آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے ہیں۔"

میں خاموش رہی۔

"صبح پانچ بجے کے قریب تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں زندہ درگور
ہوگئی ہوں، بیچ قبر بن گیا تھا کمرہ۔" اس نے وحشت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"اچھا اب اگر نیند پوری ہوگئی ہو تو میرے لیے چائے بنوا دو۔" میں
نے اپنے لہجے کو پوری طرح نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس اینٹی کلائمکس پر کوئی تبصرہ نہیں کرو گی۔" اس نے مجھ سے
نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر تم اپنے دل میں ضرور ہنس رہی ہوگی۔ خیر تمہیں اجازت ہے۔
میں وہاں نہیں رہ سکی۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ مجھے...... میرا مطلب ہے کہ
میں......" اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاید اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"اچھا سنو لال دیدی کی کہانی سنو گی۔ تم سننا چاہتی تھیں نا۔" اس نے
تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ اس نے آنکھیں جوس کے گلاس پر گاڑ رکھی تھیں۔

میں خاموش رہی۔

"سنو گی۔" اس نے بہت لجاجت سے پوچھا۔

میں مسکرائی۔

"لال دیدی بہت نیک لڑکی تھی۔ عطیہ نے رات کی جاگی ہوئی سرخ
آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔" اس کے غریب ماں
باپ نے اس کی شادی بچپن ہی میں کر دی۔ رخصتی کے وقت انہوں نے اسے
نصیحت کی۔ دیکھو لال دیدی، آج سے تم پرائے گھر کی ہوئیں۔ اب ہم تمہارے

منہ سے سسرال کا کوئی شکوہ شکایت نہ سنیں۔ تمہیں گزارا کرنا ہے وہاں صبر شکر کے ساتھ۔ ہمارا سر نیچا نہ ہونے دینا' کوئی طعنہ نہ دے ہمیں تمہارا۔"

"تو بس بڑے تحمل سے لال دیدی نے اپنی ساس کے بڑی خدمت کی اپنے سسرال والوں کی برتن مانجھے چکی پیسی سارے گھر کے کپڑے دھوئے کئی کئی میل دور پہاڑوں سے پانی بھر کے لاتی رہی ساس کی ماریں کھائیں بڑی تپسیا کا تی مگر اف نہ کی۔ ساس سارا دن اس سے دس آدمیوں کا کام لیتی اور رات کو پتھر کے ایک پیالے میں دو مٹھی ابلے ہوئے چاول اسے کھانے کو دے دیتی۔ وہ صبر شکر کر کے کھاتی۔

ایک دن اچانک لال دیدی کا باپ اپنی بیٹی کو دیکھنے اس گاؤں میں آنکلا' جب اسے اکیلا گھر میں پایا تو آہستہ سے پوچھا "کہو بیٹی کیسی ہو۔ سب اچھا تو ہے نا؟"

"بہت سکھی ہوں پتا جی۔ لال دیدی نے چہک کر کہا بہت ہی سکھی۔ بھگوان کی کرپا اور آپ کی آشیرباد سے کوئی دکھ آیا ہی نہیں مجھے راج کرتی ہوں یہاں اور دن رات آپ کو اور ماتا جی کو دعائیں دیتی ہوں۔"

سارا دن گزر گیا۔ رات کو لال دیدی کے باپ نے واپس جانے کی اجازت چاہی۔

ساس بڑی خوش تھی کہ بہو نے اپنے باپ سے اس کی کوئی شکایت نہیں کی۔ ساس نے اوپرے منہ سے کہا "بھوجن کر کے جائیے گا۔" باپ دال رکھنے کو بیٹھ گیا۔

مگر ساس ذرا پریشان ہوگئی کہ آج باپ کے سامنے لال دیدی کو دو مٹھی چاول کیسے دے' اگر زیادہ دیتی ہے تو اس کی عادت خراب ہو جائے گی۔ لال دیدی اپنی ساس کی پریشانی بھانپ گئی۔ اس نے پیالے میں دو چار چھوٹے

بڑے پتھر ڈالے اور اپنے باپ سے چھپا کر چپکے سے پیالہ اپنی ساس کو پکڑا دیا۔ پھر سرگوشی میں بولی "ان پر دو مٹھی چاول ڈال دیجئے' پیالہ بھرا ہوا لگے گا اور پتا جی کو کچھ پتہ نہ چلے گا۔"

"مگر میں لال دیدی نہیں بن سکتی یہ بات تو طے ہے۔" عطیہ نے مسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

وہ دو گھنٹے

بڑے بڑے زرد پھولوں والی سفید جارجٹ کی باریک ساڑھی سے ان کا گورا گداز بدن جھلک رہا تھا۔ ان کے سرخی مائل براؤن بال ایک ڈھیلے سے جوڑے کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے سٹول پر بیٹھی وہ بہت تندہی سے میک اپ میں مصروف تھی۔ ان کی پیٹھ میری طرف تھی اور میں ان کا باقی سراپا آئینے میں سے دیکھ سکتی تھی۔ اس عمر میں آ کر ان کا جسم کچھ کچھ فربہی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی وہ نسوانیت سے بھرپور ایک انتہائی دلکش عورت نظر آتی تھیں۔ میں انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ وہ لپ اسٹک لگانے کے لیے آگے جھکیں تو آئینے میں سے مجھے جھانکا۔ میری محویت دیکھ کر مسکرائیں اور اپنی خاص ادا سے نچلا ہونٹ ذرا سا دانتوں میں دبایا اور جب انہوں نے بالوں کو خفیف سا جھٹکا دیا تو ان کے سفید ہموار دانت اور ناک میں سجی ہوئی ہیرے کی کیل ٹیبل لیمپ کی روشنی میں ایک ساتھ جھلملائے

''وہ بیچارا فوٹوگرافر ایک گھنٹے سے باہر سوکھ رہا ہے تصویریں بنا لے تو میری بھی جان چھوٹے اور اس کی بھی۔'' انہوں نے پلکوں پر مسکارے کا آخری پچ دیتے ہوئے کہا۔

ان کی آواز ذرا سی Husky تھی اور کچھ جغادری قسم کے عشق پیشہ مردوں کا خیال تھا کہ ان کی آواز میں بھی بہت سیکس اپیل ہے۔

''تم اپنی کافی ختم کرو میں ابھی آئی پانچ منٹ میں۔'' وہ سٹول سے اٹھیں۔

''انٹرویو ہو گیا آپ کا؟'' میں نے پوچھا۔ ''دو چار الٹے سیدھے جواب دے دیئے ہیں۔ جان کو آ گیا تھا ایڈیٹر۔ مجھے یہ سب پسند ہی نہیں۔ کچھ لکھ پڑھ دیتے ہیں یہ لوگ۔ مفت کی کہانیاں بنواؤ۔ لینا نہ دینا۔''

وہ کمرے سے باہر جانے کے لیے میرے قریب سے گزریں تو Poison کا ایک خوشگوار جھونکا مجھے چھو کر گزر گیا۔

میں وقت گزاری کے لیے ان کا البم اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ان کی زیادہ تر تصاویر ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اتری ہوئی تھیں۔ کچھ میوزیکل کانسرٹس کی تھیں' کچھ تصاویر میں وہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ تھیں اور بہت خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ البم کے آخری حصے میں کسی بہت ہی پرانے گھر میں کھنچی ہوئی ان کی کچھ بلیک اینڈ وائیٹ تصویریں بھی تھیں۔ جو سب نوجوانی کی تھیں۔ ان میں سے ایک پر جیسے میری آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ اس میں وہ ٹیکہ جھومر لگائے باقاعدہ دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ بمشکل انیس بیس برس کی رہی ہوں گی اس وقت۔ بلا کا حسن اور معصومیت تھی ان کے چہرے پر۔ میں خدا جانے کتنی دیر اسی سحر میں کھوئی رہی۔ ''صورت شکل میں زرینہ بیگم کی کوئی بیٹی ان پر نہیں پڑی۔'' میں نے دل ہی دل میں افسوس کیا۔ ''سب اپنے والد پر چلی گئیں۔''

وہ واقعی بہت جلد واپس آ گئیں۔ ''چلو چھٹی ہوئی۔ اب میں اور میری پیاری بہن بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' انہوں نے لاڈ سے میری طرف دیکھا۔

''بہت شکریہ۔'' میں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''پوچھو کیا پوچھنا ہے۔'' اپنے بیڈ پر تکیہ پیرا اسٹائل میں نیم دراز ہوتے ہوئے وہ کسی ملکہ کے لہجے میں بولیں۔

''ایک چیز کی مجھے بہت کھوج ہے جس پر آپ سے ہمیشہ بات کرنا چاہتی رہی لیکن آپ کی ناراضگی کے ڈر سے۔'' میں نے بات شروع کی۔

''ایک منٹ رکو۔'' انہوں نے چہرے پر فکرمندی کا تاثر لاتے ہوئے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''تم نے میرے انکم ٹیکس والے کام کا کیا کیا؟ یہ نہ ہو فردوس کی طرح میری کوٹھی بھی نیلام ہو جائے جب تک اس طرف سے اطمینان نہ ہو ذہن کسی اور طرف جائے گا نہیں۔'' وہ بزنس کے سارے گر جانتی تھیں۔

''آپ کی اپیل ٹریبونل میں منظور ہو گئی ہے۔'' میں نے انکم ٹیکس والوں کی مہر لگا خاکی لفافہ پرس میں سے نکال کر انہیں دیا۔ ''کمشنر انکم ٹیکس سے بھی بات ہو گئی۔''

''پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' وہ چہکیں۔

''خیال نہیں رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''بی بی اب تم خود انصاف کرو۔'' انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''ثناء اللہ صاحب خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ ان کے انتقال کے بعد میں کیسے گزارا کر رہی ہوں۔ لیکن یہ انکم ٹیکس والے میری جان نہیں چھوڑتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے پرانے کھاتے نکال کر تنگ کرتے ہیں۔ اچھا چھوڑو ان باتوں کو تم کیا پوچھ رہی تھی۔''

ثناء اللہ صاحب کے نام کے ساتھ میری آنکھوں میں ان کی دلہن والی تصویر گھومی اور سوچتے ہوئے سب سوالوں کی ترتیب ذہن میں گڈمڈ ہو گئی۔

''زرینہ جی یہ بتائیں ثناء اللہ صاحب سے آپ کا نکاح کیوں نہ ہو سکا؟''

''کیسے نہیں ہوا نکاح'' انہوں نے حیرت اور خفگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''چار گواہ تو ابھی بھی لاہور میں موجود ہیں اس کے۔''

''دیکھیں آپ نے کل مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ساری باتیں سچی کریں گی۔'' ریڈیو والے قمر صاحب مجھے بتا چکے ہیں۔

''کیا بکواس کی ہے اس کمینے قمر نے۔'' انہوں نے میری بات کاٹی۔

''یہ کہ آپ کا نکاح نامہ جعلی تھا۔ ثناء اللہ صاحب کی بیگم نے اسے عدالت میں چیلنج کر دیا تھا۔''

''وہ سب سازش تھی میرے خلاف۔'' انہوں نے بہت وثوق سے کہا۔ ''سیدھے سبھاؤ کون دینا چاہتا ہے۔ جائیداد میں سے حصہ۔ قمر بے وقوف کو کیا پتہ۔ تم کبھی ادریس چودھری سے بات کر کے دیکھنا۔ وہ جانتا ہے اصل کہانی۔ ایک گواہ وہ بھی تھا میرے نکاح کا۔ بڑا پیارا انسان ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔''

''ادریس صاحب تو اکثر آتے رہتے ہیں ہمارے ہاں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک مرتبہ آپ کا ذکر آیا تو بہت افسوس کرنے لگے۔ کہہ رہے تھے کہ اگر ثناء اللہ ایک ماہ اور زندہ رہتا تو زرینہ بیگم اس کی قانونی بیوی ہوتی اور کروڑ پتی بھی۔''

زرینہ بیگم کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا اور گزر گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان کی آنکھوں میں نمی کی ایک جھلک بھی دیکھی۔ مجھے اپنے کمینے پن پر شرمندگی تو ہوئی لیکن میں آج جھوٹ سننے کے موڈ میں ہرگز نہ تھی۔ ''میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی'' میں نے وضاحت کرنا چاہی۔ ''میرا تو بس ایک اکیڈیمک انٹرسٹ ہے اس قصے میں...... میرا مطلب ہے میں آپ کی بڑی عزت کرتی ہوں اور......'' وہ تھوڑی دیر چپ رہیں۔ پھر ہلکا سا کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور

بہت نارمل آواز میں بولیں۔

''ٹھیک کہتا ہے ادریس چودھری۔ بس ہونے ہی والا تھا نکاح' 26 ستمبر کو ثناء اللہ صاحب فوت ہوئے' 18 اکتوبر کو میرا بیٹا پیدا ہوا، بدقسمت۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''جب میرے پیٹ میں تھا تب ہی کسی نے تعویذ کر دیئے تھے مجھ پر۔ میرے تمہارے جیسا وہ ہے ہی نہیں۔ بس اللہ والا ہے۔ میری بہن نے بڑی مشکلوں سے پالا ہے اسے۔'' وہ پھر ٹریک سے اتریں۔ ''آپ بتا رہی تھیں نکاح ہونے والا تھا آپ کا۔'' میں نے پوچھا۔

''شرط رکھی تھی ثناء اللہ صاحب نے کہ اگر اس مرتبہ لڑکا ہوا تو نکاح کر لوں گا۔ بہت شوق تھا بیٹے کا انہیں۔ بڑی حسرت تھی۔ بیگم میں سے بھی بیٹیاں ہی ہوئیں نا لیکن بی بی ادریس تمہیں میری کہانی بتاتے ہوئے اپنی حرامزدگی چھپ گیا۔'' زرینہ بیگم کے لہجے میں اب طنز تھا۔

''اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ جعلی نکاح نامے والی پٹی مجھے پڑھائی بھی اسی نے تھی۔ مجھ سے کہا تھا۔ بھابی ثناء اللہ تو تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر مر گیا لیکن میں تمہیں تمہارا حق دلواؤں گا بس ایک نکاح نامہ تیار کروا لو۔''

''صفورہ اور سعیدہ بھی تو ان کی بیٹیاں تھیں ان کا کوئی خیال نہیں کیا۔'' میں نے پوچھا۔

''بیٹے کی بات اور ہوتی ہے ارے ہاں'' انہیں جیسے اچانک خیال آیا۔ ''صفورہ آئی ہوئی ہے آج کل میرے پاس۔ دوسرا بیٹا ہوا ہے اس کے۔ لندن میں ہوتی ہے نا'' وہ فخر سے بولیں۔ ''بہت یاد کرتی ہے تمہیں۔ بلاؤں؟'' وہ میرا جواب سنے بغیر باہر لپکیں۔ ایک حوالے سے ان کی تینوں بیٹیاں کسی زمانے میں میری شاگرد رہ چکی تھیں۔ وہ یوں کہ میں جس کالج میں پڑھا رہی تھی اسی سے ملحقہ سکول میں وہ تینوں زیر تعلیم تھیں۔ اور کالج کے ضوابط کے مطابق اس سکول

کی دو کلاسز لینا بھی میرے فرائض میں شامل تھا۔ میرے حاضری کے رجسٹر میں تینوں کا Sirname فقیر محمد درج تھا۔ یوں سارے سٹاف کو معلوم تھا کہ صفورہ اور سعیدہ ایک بڑے زمیندار ثناء اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بڑی والی رابعہ ''نثار بھینگے'' کی۔ نثار صاحب کسی معروف شپنگ کمپنی کے مالک تھے اور ظاہر ہے کہ بھینگے بھی تھے۔ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ کالج میں زرینہ بیگم سے ان سکینڈلز کی وضاحت طلب کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ بلکہ الٹا بہت سی ٹیچرز ان کے آگے پیچھے پھرا کرتی تھیں۔ سنتے تھے کہ ان کی بہت پہنچ ہے اور وہ ہر کام چٹکیوں میں کروا سکتی ہیں۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ ان کے عروج کا زمانہ تھا۔ دولت' شہرت اور مقبولیت ان کے قدموں میں بچھی ہوئی تھی۔ چھٹی کے وقت وہ خود کار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو لینے آیا کرتی تھیں اور جب وہ اپنی شاندار شیورلٹ امپالا سے قدم نیچے اتارتی تھیں تو چلتی گاڑیوں کا پورا قافلہ انہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے رک جاتا تھا۔ ان کے بہت سے گلیمرس قصے بھی مشہور تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ جب وہ ریڈیو سٹیشن آنے کے لیے گھر سے نکل کر گاڑی میں بیٹھتی ہیں تو اسی لمحے سٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پرچہ لگ جاتا ہے۔ یہ بھی سنتے تھے کہ فلاں فلاں بیگم ان کے حُسن سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ اپنے شوہر کے سامنے ان کا نام لینے سے بھی بدکتی ہیں۔ مگر ساڑھی باندھنے کا سٹائل زرینہ بیگم ہی کا ہے کاپی کرتی ہیں۔ تب ہمیں وہ چھوٹے چھوٹے دنیوی مسائل سے بے نیاز کوئی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں اور ان کے ارد گرد سکینڈلز کا یہ ہالہ انہیں اور بھی زیادہ پرکشش بنانے میں مدد دیتا ہوا لگتا تھا۔ ثناء اللہ صاحب کی دو ''حقیقی'' بیٹیاں بھی اسی سکول میں پڑھتی تھیں اور چاروں بہنوں کی شکل و صورت میں انتہائی درجے کی مشابہت تھی مگر یہ بات نوٹ کرنے والے بھی دم سادھے رہتے تھے۔ زرینہ بیگم کو بھی اپنی قدر و قیمت اور اپنے بااختیار ہونے کا خوب اندازہ تھا

چنانچہ جب وہ اپنی کسی بیٹی کی سالگرہ پر پورے سٹاف کو مدعو کرتیں تو انویٹیشن کارڈ پر بڑے دھڑلے سے اپنے آپ کو مس زرینہ بیگم لکھتیں۔

لوگ بہت فخریہ انداز سے یہ کارڈ دوسروں کو دکھایا کرتے کیونکہ مس زرینہ بیگم کے بچوں کی سالگرہ پر شہر کے بہت سے وزیر امیر بھی مدعو ہوتے تھے لیکن اب عمر ڈھلنے کے ساتھ ان کے حسن کے آفتاب کو گہن لگتا جا رہا تھا اور اس کے نتیجے میں ان کی شہرت کا گراف بھی بہت نیچے آ گیا تھا۔ ان کی آواز اب بھی خوبصورت تھی لیکن پاپ سنگرز کی مقبولیت کی وجہ سے ان کی کلاسیکی گائیکی پس منظر میں جاتی معلوم ہو رہی تھی۔

"صفورہ بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔" انہوں نے واپس آ کر اطلاع دی۔ "دانت نکال رہا ہے۔"

"چلیں واپس آئے تو مواد دیجئے گا رابعہ کہاں ہے آج کل۔" میں نے پوچھا۔

"کینیڈا میں اس کا باپ بھی وہیں ہے۔ بڑی اچھی جگہ شادی کی ہے باپ نے اس کی۔ ایک فلیٹ بھی دیا ہے جہیز میں۔" زرینہ بیگم نے بہت خوش ہو کر کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے نثار بھی نگا۔" میں نے شرمندہ ہو کر اپنی زبان روکی۔

وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ "رک کیوں گئیں۔" انہوں نے شرارت سے کہا "جھنگے کو بھینگا ہی کہا جاتا ہے نثار سے بھی شادی وادی نہیں ہوئی میری بس پیار محبت تھا۔"

"......یہی پوچھنا چاہ رہی تھیں نا تم۔ ویسے انہوں نے رابعہ کا خیال بہت رکھا سگی بیٹیوں کی طرح۔ نیک آدمی ہیں۔ بہت بوڑھے ہو گئے اب تو۔ سفر

بھی نہیں کر سکتے۔ عرصے سے پاکستان نہیں آئے۔ رابعہ کے خطوں سے خیر خیریت معلوم ہو جاتی ہے ان کی۔"

"اس لحاظ سے صفورہ اور سعیدہ پیچھے رہ گئیں بیچاری۔" میں نے افسوس کرتے ہوئے کہا "باپ کی جائیداد میں سے کچھ بھی نہیں ملا۔"

"بس یہ کوٹھی جو اپنی زندگی میں میرے نام لگا دی تھی۔" وہ بولیں۔

"سنا ہے ثناء اللہ کی بیگم بہت بڑی جائیداد کی مالک ہیں۔" میں نے سوال کیا۔

"ہاں اور اتنے ہی چھوٹے دل والی۔" انہوں نے طنز میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بدلحاظ اور بے رحم بھی ایسی کہ کیا بتاؤں یہ بات بھی ذرا سننے والی ہے میں ثناء اللہ صاحب کے انتقال پر افسوس کرنے گئی۔ سوچا میرے بچوں کے باپ تھے۔ آخری دفعہ منہ دیکھ لوں۔ میت کے قریب نہیں پھٹکنے دیا مجھے اس نے۔ نوکرانیوں سے کہا نکالو اسے باہر۔ وہاں بیٹھی ہوئی عورتوں سے کہنے لگی۔ ذرا اس کی بے حیائی ملاحظہ فرمائیں ڈوب نہیں مرتی شرم سے کیا بتاؤں کیا گزری ہے میرے دل پر اس وقت ایسی ذلت کبھی زندگی میں نہیں اٹھائی تھی روتی دھوتی الٹے پاؤں باہر نکل آئی۔" زرینہ بیگم نے آنسوؤں کے ساتھ بہتا ہوا مسکارہ ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

"اب تو وہ مر ہی گئے تھے۔ یہ جلن حسد ختم ہونا چاہیے تھا۔ آپ کو ڈھنگ سے بیٹھنے دیتی۔" میں نے انہیں پانی کا گلاس تھماتے ہوئے کہا۔

"جلن حسد کچھ نہیں تھا۔ بس اس کو ڈر تھا کہ میں کسی چیز پر حق نہ جما لوں۔" انہوں نے حقارت سے کہا۔

"شاید یہ شوہر کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ اس میں شرکت برداشت نہیں ہوتی۔" میں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

آنسو بہاتی ہوئی زرینہ بیگم کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی

"برا نہ ماننا بی بی" انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "اس معاملے میں پنجاب کی عورت سب سے زیادہ تھوڑ دِلی ہے۔"

"ایسا تو ہے۔" میں نے فوراً اقرار کیا۔

"میرا تو سندھیوں' پٹھانوں' بلوچوں سب سے واسطہ رہا۔ ایسے بڑے دل والی ہوتی ہیں ان کی بیویاں تم تو خود بلوچستان میں رہ چکی ہو وہاں نواب صاحب کے بیٹے کی سالگرہ والی تقریب میں دیکھا تھا کیسی عزت دی تھی ان کی بیگم نے مجھے؟"

"جی بہت عزت کی تھی آپ کی" میں نے جواب دیا۔

"تین بیویاں اور تین رکھیل تھیں نواب صاحب کی۔ سب کی سب تقریب میں موجود تھیں۔ یہ ہوتا ہے حوصلہ۔" انہوں نے فخر سے کہا۔

"بڑی بیگم صوفے پر بیٹھی تھیں مجھے اپنے ساتھ بٹھایا باقی سب نیچے قالین پر' برابر نہیں بیٹھ سکتیں وہ لوگ بڑی بیگم کے۔ ایک تو پندرہ سولہ سال کی لڑکی تھی بڑی پیاری صورت کی۔ نواب صاحب کی رکھیل۔ میرے ساتھ تو بہت باتیں کرتی رہی۔ بتا رہی تھی بڑی بیگم بہت اچھا سلوک کرتی ہیں۔ سب کے ساتھ۔ نواب صاحب تو سیاست بازی کے چکر میں کئی دفعہ اندر ہو جاتے ہیں مگر ان کی عدم موجودگی میں ہم سب کا خرچ اٹھاتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں میرے گھر کھانا پکے یا نہ پکے تم لوگوں کا چولہا ٹھنڈا رہا تو سارے علاقے میں ناک کٹ جائے گی نواب صاحب کی۔" زرینہ بیگم نے داد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتایئے وہ جو آپ کے البم میں تصویر ہے جس میں آپ دلہن بنی ہوئی ہیں وہ کس موقعہ کی ہے۔" میں نے انہیں اصل قصے کی جانب لانے کے لیے پوچھا۔

میرے اس سوال نے جیسے ان کے چہرے کا سارا اعتماد سلب کر لیا۔ وہ بہت نحیف بہت کمزور آواز میں بولیں "اس قصے کو جانے دو۔ ہول آتا ہے اسے یاد کرتے ہوئے میں تو یہ بات اپنے دل سے بھی نہیں کیا کرتی...... چلو آج یہ بھی سہی......"

"جانے دیجیے۔" میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"میرا باپ مجھے اس پیشے میں لانا نہیں چاہتا تھا۔" زرینہ بیگم نے تھوڑی دیر فضا میں دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔ "سب سے چھوٹی تھی اور بڑی لاڈلی تھی اپنے باپ کی میں۔ یقین کرو سترہ اٹھارہ برس کی ہو گئی تھی لیکن خالص گھی کی چوری بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا کرتا تھا مجھے۔ گھر کا کوئی کام کاج بھی نہیں کرنے دیتا تھا۔ بڑے ناز نخرے اٹھاتا۔ میری دو بڑی بہنیں گاتی تھیں۔ جب کوئی ان کا گانا سننے آتا تو میرا باپ مجھے پچھلی کوٹھڑی میں چھپا دیتا تھا۔ تب ہم سرگودھے کے ایک چک میں رہا کرتے تھے۔ مجھے اپنا چک اب بھی بہت یاد آتا ہے۔" زرینہ بیگم نے ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ کہا۔ مگر وہ پھر فوراً ہی دوبارہ سنجیدہ ہو گئیں۔ "سرگودھے کا ایک نوجوان زمیندار عمر حیات میری بہنوں کا گانا سننے آیا کرتا تھا۔ پتہ نہیں اس نے کیسے مجھے ایک دن دیکھ لیا۔ فریفتہ ہو گیا۔ میں تو شادی کروں گا اس کے ساتھ رٹ لگا دی۔ میرے باپ نے اسے آزمانے کے لیے کہا "پانچ مربعے زمین میری بیٹی کے نام لگاؤ۔" عمر حیات اس پر بھی تیار ہو گیا۔ میرے باپ نے سوچا "میری بیٹی بیگم بنے گی۔ عزت کی روٹی کھائے گی۔" ہاں کر دی۔ عمر حیات نکاح کر کے مجھے اپنی زمینوں پر لے گیا وہاں اس کی حویلی تھی۔ وہاں پہنچنے کے تیسرے دن مجھ سے کہا "اب تمہارا اپنے گھر والوں سے ملنا جلنا ختم نہ تم جاؤ گی نہ وہ لوگ آئیں گے۔ خط لکھ دو اپنے

باپ کو۔" میں بچی تھی ڈر کے لکھ دیا خط۔ میرے گھر والے بھی صبر شکر کر کے بیٹھ گئے۔ میرا بھلا چاہتے تھے وہ۔"

"آپ کو گھر والے یاد تو آتے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"باپ بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر رویا کرتی۔ پر پھر میرے ہاں بچہ ہونے والا ہو گیا تو ذرا دھیان بٹ گیا۔ میرا بیٹا چھ دن کا تھا تو میرے باپ کو کسی نے اطلاع دی وہ بیچارا محبت سے مجبور ہو کر نواسے کو دیکھنے آ گیا' مجھے ملازمہ نے اندر آ کر بتایا۔ میں بچے کو اٹھا کر ننگے پاؤں دوڑی باہر مردان خانے کی طرف۔ سامنے سے عمر حیات آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے بچہ چھین لیا۔ بولا "اس کی دونوں ٹانگیں چیر دوں گا اگر باپ کی شکل بھی دیکھی تو۔" میں روتی چیختی واپس آ گئی۔ میرے باپ کو بھی اس جھگڑے کی سن گن مل گئی تھی وہ باہر سے ہی چلا گیا۔"

"پھر" میں نے پوچھا۔

"میرا بیٹا ساڑھے چار ماہ کا ہو کر مر گیا۔ اس کے دل میں سوراخ تھا پیدائشی' ڈاکٹر کہتے تھے ذرا بڑا ہو گا تو آپریشن کریں گے۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔" زرینہ بیگم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"بس اچانک میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور بہت اچھا کیا۔ میرے بچے کے قل تھے۔ بہت عورتیں گھر میں آ جا رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے ایک کا برقعہ اٹھا کر پہنا اور بھاگی لاریوں کے اڈے کی طرف۔ وہاں بولائی ہوئی پھر رہی تھی کہ سامنے سے نثار صاحب اپنی گاڑی میں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں انہیں پہچانتی تھی میری بہنوں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا' سارا قصہ سنایا۔ وہ مجھے بٹھا کر گھر لے آئے میرے۔"

"نثار صاحب نے تو اس دن پہلی دفعہ آپ کو دیکھا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔" زرینہ بیگم نے جواب دیا۔ "اور پھر اگلے دو چار سال دیکھتے ہی رہے۔ سارے گھر والوں کا خرچ اٹھایا۔ مجھے گانا سیکھنے کے لیے استاد رکھ کر دیا۔ پر مجھے باقاعدہ رکھا نہیں ان کا کاروبار باہر تھا۔ بعد میں تو بالکل ہی باہر کے ہو کر رہ گئے۔ ثناء اللہ صاحب سے بھی انہوں نے ہی مجھے ملوایا تھا جب کینیڈا جانے والے تھے نیک آدمی تھے نثار صاحب۔"

"عمر حیات کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے پانچ مربعے زمین واپس کر دی اور طلاق لے لی اس سے۔"

"زرینہ جی آپ کو کبھی محبت بھی ہوئی کسی سے' سچی محبت۔"

"محبت کا تو پتہ نہیں۔" انہوں نے ذرا سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "پر مجھے ثناء اللہ صاحب اچھے بہت لگتے تھے۔ بالکل میرے باپ کی طرح میرے نخرے اٹھاتے تھے۔ مجھے سوسائٹی میں عزت مقام سب انہوں نے دلوایا۔ لاہور میں کوٹھی لے کر دی۔ نوکر چاکر۔ گاڑی روپیہ پیسہ۔ ہر طرح سے سکھ دیا۔ ریڈیو والوں سے بھی انہوں نے ہی ملوایا۔

وہ میری گائیکی کے سچے مداح تھے۔ میں تو انہیں پا کر اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ پر اللہ نے انہیں مجھ سے چھین لیا۔ ان کے بعد تو ایسے ایسے کمینے مردوں سے واسطہ پڑا کہ میں نے عہد کر لیا کہ اپنی بیٹیوں کو کبھی گانے کی طرف نہیں لاؤں گی۔ حالانکہ تینوں کی آوازیں میری طرح ہیں۔ بس اچھے شریف لڑکے دیکھ کر جلدی جلدی تینوں کی شادیاں کر دیں۔"

"ہاں مجھے یاد ہے آپ تو اپنی بچیوں کو سکول کی کسی تقریب میں بھی

گانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔" میں نے کہا۔

"بس اب بھی دعا ہے کہ اللہ انہیں دنیا کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے۔" زرینہ بیگم نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں بلند کیے۔ "میں خود بھی ان چیزوں سے الگ تھلگ ہوگئی ہوں۔ بس گانا وانا رکھا ہوا ہے۔ عمر بھی ڈھل رہی ہے۔" انہوں نے بہت Matter of Fact انداز میں کہا۔

"آخری آدمی کون تھا آپ کی زندگی میں۔" میں نے پوچھا۔

"کراچی کا ایک سیٹھ تھا۔ بہت کمینہ اسی کی وجہ سے دل اچاٹ ہوگیا ہر بات سے۔"

"کیا کمینہ پن کیا تھا اس نے۔"

"بی بی اس نے مجھے تیس ہزار ماہوار پر رکھا۔ پہلی تاریخ کو جب میں نے پیسے مانگے تو پندرہ ہزار نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔" میں نے کہا "سیٹھ صاحب باقی رقم۔" بولا "سات دن تو تمہاری طرف سے نکل گئے۔ ایک ہفتہ میں خود نہیں آسکا۔ وہ پیسے کاٹ لیے میں نے۔" تاؤ آ گیا مجھے۔ کھڑے کھڑے نکال دیا اسے۔ بس اس دن سے تو یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ "اللہ میری بچیوں کو ایسے حالات میں کبھی نہ ڈالے۔ عزت کے ساتھ بیٹھی رہیں اپنے گھروں میں۔"

"خدا نے آپ کی سن بھی لی ہے ماشاءاللہ تینوں اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ آپ کے دکھوں کی تلافی تو یوں ہوگئی۔" میں نے بہت محبت سے کہا۔

"بہت خوش ہیں اللہ سب کی بیٹیوں کے نصیب ایسے کرے۔ یورپ اور امریکہ کی سیر یں......"

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور صفورہ تنتناتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ "آج بھی نہیں نکلوائے آپ نے پیسے۔" وہ پوری طاقت سے چیخی۔ "بینک کا ٹائم گزار دینا۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھے ماں سے مخاطب تھی اس نے

مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

"صفورہ اپنے کمرے میں جاؤ۔" زرینہ بیگم نے بڑے تحمل سے کہا۔ "میں وہاں آکر بات کرتی ہوں۔"

"سات دن سے اپنے کمرے ہی میں ہوں۔" وہ پھر چیخی۔ "ڈھائی لاکھ دیتے ہوئے بھی جان نکل رہی ہے آپ کی۔ ابھی پھر کال آئی ہے ظفر کی لندن سے وہ کار کا سودا کر چکا ہے آپ نے تو ڈھٹائی کی حد......" اس نے میری طرف دیکھ کر زبان روکی۔ میں باہر جانے کے لیے اٹھی۔ "بیٹھ جاؤ بی بی۔" زرینہ بیگم نے حکم دیا۔ مجھے ان کا ستا ہوا زرد چہرہ دیکھ کر ڈر لگا۔

"اسے سمجھاؤ تمہاری تو شاگرد ہے۔ بلیک میل کر رہا ہے اس کا شوہر اسے بھی اور مجھے بھی۔ یہ آخر کب تک میرے پیسے کے سر پر......" زرینہ بیگم روہانسی ہو کر چپ ہو گئیں۔

"تو میں بھی آ جاؤں پھر سعیدہ کی طرح اجڑ کر آپ کے پاس۔" صفورہ نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرد لہجے میں کہا۔

"لعنت ہے ایسے بسنے پر ہر روز ایک نیا مطالبہ۔" زرینہ بیگم اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔ ان کے آنسو اس چیک پر بھی گرے جس پر وہ لرزتے ہاتھوں سے دستخط کر رہی تھیں۔

گہن

سب سے پہلے بڑی والی نے ذرا سے پائینچے چڑھائے اور کیچڑ سے بھری ہوئی دہلیز کی تینوں سیڑھیاں پھلانگ کر گلی میں کود گئی۔ اس احتیاط پر بھی اس کی سفید لٹھے کی شلوار پر کیچڑ کے دھبے پڑ گئے۔ پھر سب سے چھوٹی نے یہ معرکہ سر کیا۔ اب اس درمیان والی کی باری تھی جس کے پاؤں میں کچھ نقص تھا اور تھوڑا سا لنگڑاتی تھی۔ کوشش اس نے بھی کی مگر پاؤں غلط پڑا اور وہ پہلی سیڑھی سے پھسلتی ہوئی گلی کے کیچڑ میں آ کر دھپ سے گر گئی سارے کپڑے لت پت ہو گئے۔ شاید اسے چوٹ بھی لگی ہوگی مگر اس نے ادھر ادھر دیکھا، گلی خالی تھی، فوراً کھڑی ہوئی اور چھپاک سے اندر چلی گئی۔ ظاہر ہے کہ اس بیچاری کو معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی کھڑکی میں کھڑی سارا نظارہ دیکھ رہی ہوں۔ گلی تک صحیح سلامت پہنچنے والی دونوں بہنوں نے تھوڑی دیر اس کا انتظار کیا پھر چھوٹی والی نے جھلا کر زور زور سے دروازہ پیٹا اور وہیں سے بولی۔ "اب اندر جا کر یہاں مر گئی ہو؟ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ نو بجے والی بس بھی نکل جائے گی۔" اس کے چیخنے چلانے پر درمیان والی باہر آئی اور بہت بگڑ کر مگر آواز آہستہ کر کے بولی۔ "اب میں تمہارا سر پھوڑ کر کالج جاؤں، تمہیں نہیں پتہ...... جاؤ تم لوگ۔" دونوں بڑبڑ کرتی ہوئی

بس سٹاپ کی طرف چل دیں۔

آج بھی روزانہ کی طرح تینوں نے سفید لٹھے کے سوٹوں کے ساتھ بہت خوبصورت رنگوں کی ململ کے چنے ہوئے دوپٹے اوڑھ رکھے تھے۔ مجھے ان کے کاسنی ہرے، گلابی اور بسنتی چنے ہوئے دوپٹے ہمیشہ بہت بھلے لگا کرتے تھے۔ انہوں نے ناک میں لال پیلے موتیوں والی نازک سی کیلیں بھی ضرور پہن رکھی ہوتیں۔ سچ پوچھئے تو تینوں بہنیں بہت بانکی تھیں۔ اچھے ناک نقشے اور صاف رنگت والی قد بھی لمبے۔ درمیان والی چونکہ زیادہ چلتی پھرتی نہیں تھی اس لیے اس کا جسم ذرا سا بھاری ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے چہرے کے تیکھے پن اور جسمانی کشش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں اپنی حسن پرستی کی وجہ سے تقریباً ان سب پر فریفتہ تھی اور محض انہیں بنا سنورا ہوا دیکھنے کے لیے صبح آٹھ بجے کے قریب اپنی کھڑکی میں آ کر کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔ جو عین گلی میں کھلتی تھی۔ ان لوگوں نے کچھ عرصہ بیشتر میرے ساتھ والا مکان کرائے پر لیا تھا۔ مکان انتہائی شکستہ حالت میں تھا اور پچھلے تین برس سے خالی پڑا تھا۔ سنتے تھے کہ اس کی چھتیں کسی وقت بھی گر سکتی ہیں۔ لوگ انہیں یہ بات بتانا چاہتے تھے مگر لڑکیاں پورے محلے میں کسی سے میل جول نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ ان کی ماں مر چکی ہے باپ نکھٹو اور نشے کا عادی ہے، بہت غصیلا بھی ہے نہ خود کسی سے ملتا ہے نہ لڑکیوں کو ملنے دیتا ہے۔ کم از کم میں نے تو اس کی صورت بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس کنبے کے متعلق معلومات کا ایک ذریعہ میرا ملازم بھی تھا جو اپنے تر سے پن کی وجہ سے سارے محلے کی ٹوہ میں رہتا اور ادھر کی ادھر لگایا کرتا تھا۔ ایسے ہی چل رہا تھا کہ ایک دن جب میں کالج جانے کے لیے نکلی تو چھوٹی والی کو باہر گلی میں اپنا انتظار کرتے دیکھا۔ اس نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا پھر

بہت دھیمی آواز میں بولی۔ ’’میں آپ سے ایک شکایت کرنا چاہتی ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہاں ہاں بتاؤ۔‘‘ اس نے آنکھیں نیچی کر کے پہلے سے بھی آہستہ آواز میں کہا۔ ’’دیکھئے باجی! آپ اپنے نوکر کو سمجھائیں مجھے چھیڑتا ہے۔‘‘ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ’’کیا واقعی؟‘‘ ’’میں ابھی اس کی خبر لیتی ہوں۔ کیا کہا ہے اس نے تم سے۔‘‘ لڑکی کے ہونٹ ذرا سے تھرتھرائے جیسے وہ کچھ کہنے والی ہو مگر اس نے صرف ایک نظر مجھے دیکھا اور بغیر کچھ کہے واپس مڑ گئی۔ مجھے اپنے ملازم پر سخت غصہ آیا' میں نے کالج کا ارادہ ترک کیا اور گھر آ گئی۔

’’تم نے ساتھ والوں کی لڑکی کو چھیڑا ہے' شرم نہیں آتی تمہیں۔‘‘ میں اس پر برس پڑی۔ ’’بکواس کرتی ہے وہ۔‘‘ میرا ملازم جو انتہائی منہ پھٹ اور بدتمیز تھا اس نے مجھ سے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔ ’’جھوٹ مت بولو' وہ بھلا خواہ مخواہ تمہاری شکایت کیوں کرے گی۔‘‘ ’’باجی! آپ کو پوری بات تو معلوم نہیں ہوتی بس ڈانٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔‘‘ میں نے تو اسے بس اتنا کہا تھا کہ ’’آپ لوگ جو اُدھار لیتے ہیں وہ اتار بھی دیا کریں دیکھیں نا' اب پچھلے ہفتے ان کے ہاں مہمان آئے تھے تو یہ چھوٹی نکڑ والی دکان سے چھ کوکا کولا کی بوتلیں لے کر آئی تھی ادھار۔ دکاندار میرا دوست ہے اس نے کل مجھ سے کہا' ہمسایوں سے کہو بوتلوں کے پیسے تو بھجوائیں' بس میں نے اتنی بات کی تھی لڑکی سے۔‘‘

’’تمہیں پرائے معاملے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے' مجھے اس پر اور بھی غصہ آیا' وہ جانیں اور دکاندار' تم کون ہوتے ہو' خبردار آئندہ اگر ایسی کوئی بات کی تو۔‘‘

باجی! آپ ان تک چڑھیوں کی اتنی سائیڈ کیوں لیتی ہیں۔ میرا ڈھیٹ ملازم بولا۔ ’’خواہ مخواہ میری شکایت کر دی آپ سے' اچھا کیا تھا جو اس دن میں نے ان لوگوں کو گلاس نہیں دیئے تھے' ٹوٹ جاتے تو آپ اور ڈانٹتیں۔‘‘

’’کون سے گلاس۔‘‘ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اسی دن مانگنے آئی تھی نا یہ چھوٹی والی' جب مہمان آئے تھے ان کے' آپ کالج تھیں میں نے کہا ’’باجی کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں دوں گا۔ اس کے چہرے پر ایک خبیث مسکراہٹ آئی' گھر میں برتن تک ہے نہیں بڑے فیشن کرتی ہیں۔‘‘

’’تمہیں دینے چاہئیں تھے گلاس۔‘‘ میں نے دل ہی دل میں سارے واقعے پر افسوس کرتے ہوئے کہا۔

ویسے باجی! وہ جو لڑکا ہے نا مشتاق' جو دوائیوں کی دکان پر بیٹھتا ہے' وہ ان کا رشتہ دار ہے' اسی سے ان کا باپ نشے کے ٹیکے منگواتا ہے۔ اس نے مجھے ایک بات بتائی ہے۔ ’’کیا؟‘‘ میں نے ایک کے بعد ایک انکشاف سے ادھموئی ہو کر کہا۔

وہ کہہ رہا تھا ’’اس دن وہ مہمان بڑی کے رشتے کے لیے آئے تھے مگر کوئی بات کیے بغیر ہی چلے گئے۔ وہ کہتے ہیں' لڑکی تو خوبصورت ہے' اچھی ہے مگر گھر میں دو ٹوٹی کرسیاں بھی نہیں ہیں' ایسوں کے گھر ہم رشتہ نہیں کریں گے۔‘‘

’’چہ چہ' افسوس‘‘ میں نے تاسف سے سر ہلایا۔

باجی! ان لڑکیوں کے پاس بس دو دو جوڑے ہیں کپڑوں کے۔ میرے ملازم نے رازداری سے کہا۔ ’’نیلے پیلے دوپٹے تو گھر میں رنگتی رہتی ہیں اور بڑی شو مارتی ہیں۔ ململ کا تھان بھی ان کو مشتاق نے ہی دیا تھا' باجی! وہ کہہ رہا تھا! اس دن بڑی والی بہت بجی بنی تھی مہمانوں کے لیے' کسی سہیلی سے ریشمی سوٹ بھی مانگ کر لائی تھی۔ ’’نہاتی دھوتی رہ گئی تے منہ تے کھی بہ گئی۔‘‘ وہ ہنسا۔

’’خدا کا خوف کرو ایسی باتیں نہ کیا کرو' بہت اچھی لڑکیاں ہیں۔ مجھے

سمجھ نہیں آتا کہ تم کیوں ان کے دشمن بن گئے ہو؟''

میں واقعی حیران تھی۔

''لو! محلے کے سارے لڑکے ان کے دشمن ہیں۔'' اس نے اترا کر کہا۔ ''دیکھیں نا! اوقات تو کوئی ہے نہیں اور سمجھتی ہیں اپنے آپ کو شہزادیاں' کوئی لڑکا ذرا سلام کر دے تو کھڑے ہو کر گالیاں دینا شروع کر دیتی ہیں۔ دیکھیں گے کون سا شہزادہ آتا ہے ان کے لیے۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اب میں دشمنی کی وجہ بھانپ گئی تھی۔

شہر میں ملیریے کی وبا پھیلی۔ میں بھی دس دن بخار میں بے ہوش پڑی رہی۔ جس دن بستر سے اٹھی' پہلی خبر اپنے ملازم سے یہ سنی کہ بڑی والی گھر سے بھاگ گئی۔

''ہو سکتا ہے وہ بیچاری اپنے کسی رشتے دار وغیرہ کے گھر گئی ہو۔'' میں نے ذرا جرح کی۔

''ہاں باجی! یہ لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں کہ چچا کے ہاں گئی ہے۔ جھوٹ بولتے ہیں' اس دن بڑا شور مچا تھا ان کے گھر میں' وہ بڈھا' جھڑوس ان کا باپ بھی اپنے بل سے باہر نکلا تھا' صحن میں آ کر اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل چھڑک لیا۔ بولا! میں تو آگ لگا لوں گا' لڑکیاں چیخنے لگیں' تب وہ آپ کی پہلی صغریٰ باجی ہیں نا وہ گئی تھیں' باپ تو انہیں دیکھ کر کمرے میں گھس گیا۔ لڑکیاں کہنے لگیں۔'' بڑی والی اباجی سے پوچھے بغیر چچا کے ہاں چلی گئی ہے اس لیے وہ بہت غصے میں ہیں۔'' مگر باجی مجھے تو مشتاق نے ساری بات بتا دی ہے نا وہ کہتا ہے ''اس لڑکی نے چھپ کے شادی بھی کر لی ہے کسی سے...... ایک بس ڈرائیور سے۔'' اس کے لہجے میں کمینہ پن آیا اور بتاؤں' ان لوگوں کا کمن آباد میں ایک

مکان ہے۔ اس کا کرایہ بھی آیا ہوا تھا..... چار سو' باپ کہہ رہا تھا کہ بڑی والی وہ بھی لے کے چلی گئی ہے...... اب باقی دونوں کالج نہیں جا رہیں' میرا خیال ہے بس کا کرایہ بھی نہیں ان کے پاس۔ میرے ملازم کے اندازے ہمیشہ درست نکلا کرتے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر سوچا پھر اپنے چھوٹے بیٹے کو جو تب آٹھ نو برس کا تھا بلا کر کہا' میں تمہیں کچھ پیسے دیتی ہوں' ساتھ والی باجیوں کو دے آؤ...... ''کہو امی نے بھیجے ہیں۔''

میں نے ہزار روپے ایک لفافے میں ڈال کر اسے پکڑائے۔ میرا بیٹا گیا اور فوراً ہی واپس آ گیا۔ پیچھے پیچھے چھوٹی والی لفافے سمیت۔

''جی ہمیں ضرورت نہیں پیسوں کی.... آپ کی مہربانی''.... اس نے لفافہ میز پر رکھا اور چلی گئی۔

میں ابھی سارے واقعے پر غور ہی کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''باجی وہ بڈھا' ان کا باپ آیا ہے آپ سے ملنے۔'' میرے ملازم نے بہت ایکسائیٹڈ لہجے میں بتایا۔

''بلاؤ......''

میلی سی سفید شلوار قمیض پہنے' اُلجھے ہوئے بالوں والا ایک شخص اندر آیا۔ دبلا پتلا' چہرے پر زردی' مگر اس حالت میں بھی پتہ چل رہا تھا کہ وہ کسی زمانے میں انتہائی خوش شکل رہا ہوگا' بیٹیاں یقیناً اسی پر پڑی تھیں۔

''آپ نے ابھی بچیوں کے لیے کچھ رقم بھجوائی تھی۔'' اس نے نہایت مہذب لہجے میں بات شروع کی۔

''جی جی دراصل وہ ایسا ہے''...... میں ذرا گھبرائی۔

''غالباً نغمہ نہ وہ رقم واپس کر گئی ہے آپ کو۔''

''جی ہاں''...... میں نے بمشکل کہا۔

''بچی ہے' سنگینیٔ حالات کا اندازہ نہیں ابھی......ایسا ہے محترمہ کہ اس مرتبہ ہمارے کرائے دار نے ادائیگی میں کچھ دیر کردی ہے' وہی ہماری آمدنی کی واحد صورت ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ وہ رقم بطور قرض مجھے عنایت کردیں میں انشاءاللہ جلد لوٹا دوں گا۔''

''میں نے جلدی سے لفافہ آگے بڑھایا۔''

''ایک گذارش اور ہے' اس نے پیسے کرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔'' بچوں کو اس معاملے کی خبر نہیں ہونا چاہیے ان کے دل کو تکلیف ہوگی' آپ جانتی ہیں کہ وہ عمر کے جس حصے میں ہیں اس میں انا اور عزتِ نفس بہت پیاری ہوتی ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔''

''بے حد شکریہ' آپ بہت ہمدرد خاتون معلوم ہوتی ہیں' کسی اونچے خاندان کی' ہم لوگوں نے بھی بہت اچھا وقت دیکھ رکھا ہے' اس نے ایک آہ بھری۔ بس ان کی والدہ معدے کے کینسر میں مبتلا ہوئیں تو لاکھوں روپیہ خرچ ہوگیا' بیرون ملک بھی لے گیا تھا علاج کی غرض سے' مگر زندگی نہیں خرید سکا ان کی۔ اسی پریشانی میں میری ملازمت بھی جاتی رہی۔ سمن آباد میں ہمارا ذاتی مکان ہے' حالات ایسے بگڑے کہ مجبوراً اسے کرائے پر اٹھا کر اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہنا پڑا' کیا عرض کروں محترمہ نجیب الطرفین سید زادہ ہوں' ہزاروں روپے خیرات کیا کرتا تھا کبھی' آج آپ......آپ کے دروازے پر بیٹھا ہوں۔'''' آپ ایسا کوئی خیال دل میں نہ لائیں' آخر ہمسائے کا کوئی فرض ہوتا ہے۔'' میں اس کی شائستہ اور مہذب گفتگو سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔

''آپ نے بن ماں کی بچیوں کے سر پر ہاتھ رکھا ہے' میں شکر گزار ہوں' بہت پریشان رہتا ہوں' ان کی وجہ سے' تینوں جوان ہوگئی ہیں......بڑی

والی شاہانہ کو تو اس کے چچا نے کوئٹہ بلوالیا ہے اور وہ اپنی تعلیم وہیں مکمل کرے گی' کوئی اچھا لڑکا تلاش کرکے شادی بھی کردیں گے اس کی وہ لوگ۔ اب رضوانہ اور نغمانہ کی ذمہ داری ہے میرے سر پر' مناسب رشتوں کی تلاش میں ہوں پر آپ جانتی ہیں آج کل خاندان' تعلیم' شکل وصورت کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا' بس پیسہ ہونا چاہیے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ بیمار رہتا ہوں' گردے میں تکلیف ہے' بہت مہنگے انجکشن لگتے ہیں مجھے' محلے والے جسے نشے کا ٹیکہ سمجھتے ہیں۔'' اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ آئی......'' اچھا اب چلتا ہوں' آپ کا بہت وقت ضائع کیا......وہ کچھ خریداری کرنی ہے مجھے۔'' وہ دفعتاً کھڑا ہوگیا۔

میں اس کے جانے کے بعد بڑی دیر تک گُم سُم بیٹھی رہی۔ پھر اچانک ایک خیال سوجھا اپنی سہیلی صغریٰ کو فون کرکے بلوایا۔ وہ نیکی' بھلائی کے کام بہت کرتی رہتی ہے۔ اسے رام کہانی سنائی۔

''بھئی فوراً دونوں لڑکیوں کے لیے بر تلاش کرو' ایسی خوبصورت خاندانی لڑکیاں برباد ہورہی ہیں' لوگ خراب کردیں گے انہیں۔'' میں نے حکم صادر کیا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں' آج سے ہی تلاش شروع۔'' صغریٰ نے ایک رضا کار کے لہجے میں کہا' میرے میاں تو بتا رہے تھے کہ یہ ملتان کا بہت اونچا سیّد گھرانہ ہے......بس ذرا یہ باپ کے نشے والی بات......اور وہ جو بڑی والی بھاگ گئی......

''ارے چھوڑو' ہمیں باپ سے کیا لینا دینا۔'' میں اس وقت ان لوگوں کے سارے گناہ بخشنے کے موڈ میں تھی......'' ہوسکتا ہے بیچارا اپنے غم بھولنے کے لیے نشہ کرتا ہو۔'' اور بڑی والی نے تو ایک شریف آدمی سے شادی کرلی ہے......تم باقی دونوں کی سوچو۔

''اچھا سنو......وہ بولی میرا ایک بھانجا ہے فوج میں کیپٹن ہے......پکا سماج کا باغی' ذرا حسن پرست بھی ہے' چھوٹی نغمانہ کی بات چلاؤں اس سے۔'' صغریٰ کا ذہن ان باتوں میں بہت تیز چلتا ہے۔ کیا کہتی ہو؟ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر بے چینی سے سوال کیا......دراصل میں سوچ رہی تھی کہ ''یہی نا کہ درمیان والی رہ گئی' بھئی اب وہ تو لنگڑی''......صغریٰ نے اپنی زبان روکی۔

''ایسے تھوڑا سا نقص ہے پاؤں میں''......میں نے فوراً اس کا دفاع کیا......خیر تم چھوٹی کی بات ہی لگوا دو۔

''بھئی وہ میرا بھانجا لڑکی سے خود ملنے پر اصرار کرے گا' اس کا انتظام کرو۔''

''ابھی لو۔''

میں نے دوسرے دن بڑے میاں سے بات کی......''آپ درمیان میں ہیں تو مجھے پورا اطمینان ہے' بچے سے کہیے آج شام کو آ کر لڑکی کو دیکھ لے۔'' انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔ میں نے صغریٰ کو فون کیا۔

تین دن تک صغریٰ کی طرف سے کوئی پیغام سلام نہیں آیا۔ چوتھے دن میں بے قرار ہو کر اس کے ہاں پہنچی......خالہ اور بھانجا دونوں منہ لٹکائے لاؤنج میں بیٹھے تھے......''کیا ہوا؟ دیکھ لی لڑکی؟'' میں نے بے چینی سے سوال کیا۔

''بھئی شبنم یہ تیار نہیں ہوتا تم خود ہی بات کر لو۔'' صغریٰ نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے بھانجے کی طرف دیکھا......''آنٹی میں بہت شرمندہ ہوں مگر......ایسے گھر میں''......

''گھر کو کیا ہے بس غریب لوگ ہیں تمہیں ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔''

مجھے ذرا غصہ آیا۔

''نہیں یہ بات نہیں۔'' لڑکے نے اپنے لفظوں پر بہت زور دے کر کہا۔

''پھر۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے صغریٰ کی طرف دیکھا۔

انہیں بتا دو ساری بات بھیا۔

''آنٹی دیکھنے لڑکی تو مجھے پسند آئی تھی بہت خوبصورت ہے۔ بات چیت میں بھی اچھی ہے مگر ان کا باپ......''کیا کیا باپ نے؟''

ایک لمحے کے لیے لڑکے کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑی ''آنٹی! جب میں لڑکی سے مل کر اٹھنے لگا تو اس کے ابا بھی میرے ساتھ باہر آ گئے......پوچھنے لگے' کیسی لگی میری بچی......مجھے شرم تو آئی مگر میں نے پھر بھی کہہ دیا ''اچھی ہے جی۔'' آپ خالہ صغریٰ سے بات کر لیں۔ اس پر بولے کہ ''وہ تو میں کر ہی لوں گا لیکن اس وقت تم سے مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا ''فرمائیے۔'' بولے ''بیٹا گھر پر بہت برا وقت آیا ہوا ہے......راشن لانے کے پیسے بھی نہیں ہیں' تمہاری جیب میں ہزار دو ہزار ہوں تو دے جاؤ' پر بیٹا میری بچیوں سے کوئی ذکر نہ کرنا وہ بہت حساس ہیں۔'' آنٹی! میں تو سکتے میں رہ گیا۔ ہزار روپیہ ان کے ہاتھ میں رکھا اور سرپٹ بھاگا۔ دیکھئے کیا بے غیرت شخص ہے......اب ایسے گھر میں شادی......لڑکے نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا

اس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد میرے ملازم نے آ کر اطلاع دی۔

''چھوٹی والی بھی بھاگ گئی۔''

میں سبزی کاٹ رہی تھی چھری ہاتھ سے گر گئی۔

''کیسے؟''

''باجی! وہ مشتاق ہے نا ان کا رشتے دار اس کے ساتھ سیالکوٹ چلی گئی ہے۔ بڈھا پولیس میں رپورٹ لکھوانے گیا ہے۔ کچھ نہیں بننے والا الٹا تھانیدار اسی کو جوتیاں لگائے گا۔ باجی انہوں نے پہلے نکاح کیا ہے چوہدری جی کی مسجد میں جا کر، کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا میرا دوست۔'' وہ شیخی سے بولا۔

''ہائے ہائے بیچاری نعمانہ اکیلی رہ گئی۔'' میرے منہ سے ایسے ہی نکلا۔

''وہ تو ہے بھی لنگڑی، بھاگے گی کیسے؟'' میرے ملازم نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری ہجرت

علی رضا صبح سویرے دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ملازم نے آکر کہا۔ ''سر جی ایک برقعے والی بی بی آپ سے ملنے آئی ہے۔''

''تم نے بتایا نہیں بیگم صاحب یہاں نہیں ہیں۔'' ان سے کہو کوئی کام ہو تو مجھے دفتر میں مل لیں، کہہ دینا صاحب دفتری کاموں کے لیے گھر پر نہیں ملتے۔''

''میں نے ساری بات بولی تھی جی۔'' کہنے لگیں۔ ''ہم ان کے والد رجب علی شاہ صاحب کے واقف ہیں۔ مجلسیں پڑھنے آیا کرتے تھے ان کی حویلی میں۔ کہتی تھیں تم انہیں جا کر بتاؤ وہ فوراً ہمیں بلا لیں گے۔'' ملازم نے ذرا جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

''کچھ نام بتایا اپنا؟''

''الماس باجی وہ کہتی ہیں، دلشاد کی بڑی بہن ہوں؟'' ملازم نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔

شیو کرتے ہوئے رضا کا ہاتھ ذرا سا کانپا۔ ''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ میں آتا ہوں۔''

''یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ رضا نے سوچا کہ آج بائیس سال بعد جب ان لوگوں کو اچانک مجھ سے ملنے کی سوجھی ہے تو شمس آرا امریکہ گئی ہوئی ہے۔ ورنہ خاصی آکورڈ سچوایشن ہو جاتی۔ شمس آرا تو یوں بھی پینڈورا باکس کھولنے کی خاصی شوقین ہیں۔ کیا کچھ نہ نکلتا اس میں سے۔''

بائیس سال گزر گئے رضا نے بے یقینی سے دل میں دہرایا۔ پھر اسے دلشاد سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی۔ محرم کی ساتویں تھی۔ وہ حویلی کے عزا خانے میں تھا اور کچھ عزاداروں کے ساتھ مل کر حضرت قاسم کی مہندی سجا رہا تھا۔ جب دلشاد کا فون آیا۔

''ابھی آ کر ملو فوراً۔'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں رضا سے کہا تھا۔

''دلشاد محرم کا مہینہ ہے خدا کا خوف کرو۔ میں کیسے آ سکتا ہوں وہاں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' رضا نے غصے میں جواب دیا۔

''تمہیں حضرت عباس کا واسطہ میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ یہاں آنے کا سارا گناہ میرے ذمے۔ پانچ منٹ کے لیے آ کر بات سن لو۔ میں ڈاکٹر زہرا کے کلینک سے بول رہی ہوں یہیں آ جاؤ۔'' دلشاد نے فون رکھ دیا۔

''شاہ جی ابھی تک دیگیں نہیں پہنچیں۔ چھ بج گئے ہیں۔ میں پتہ کر کے آتا ہوں۔'' رضا نے اپنے والد سے بہانہ بناتے ہوئے کہا جو باہر گلی میں کھڑے نیاز کے لیے آیا ہوا گوشت جیپ سے اتروا رہے تھے۔ ''جلدی آنا عزادار جمع ہو رہے ہیں غائب نہ ہو جانا۔'' ''دس منٹ میں واپس شاہ جی۔'' اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی حویلی سے شاہی محلے کا راستہ بس پانچ سات منٹ کا تھا مگر آج اسے یہ راستہ بہت طویل محسوس ہوا۔

محرموں میں وہاں جاتے ہوئے اسے شدید احساسِ ندامت بھی ہو رہا

تھا۔ اس نے رکشے کو گلی کے شروع ہی میں رکوا لیا اور خود تیز تیز چلتا ہوا ڈاکٹر زہرا کے کلینک تک پہنچا۔ کلینک کے ویٹنگ روم میں شاہی محلے کی تین چار نوجوان لڑکیاں اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ رضا نے انہیں کئی مرتبہ دلشاد کے ہاں دیکھا تھا۔ ایک نے اسے پہچان کر سلام کیا۔

''ڈاکٹر صاحب دیکھ رہی ہیں دلشاد کو۔ آپ بیٹھیں ابھی آتی ہے وہ دو منٹ میں۔''

دلشاد واقعی دو منٹ میں باہر آ گئی۔ اس کی براؤن آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں اور کچھ آنسو اس کے رخساروں پر ابھی تک ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بڑی سی پھولدار چادر سے اپنے آپ کو اچھی طرح سے لپیٹا ہوا تھا۔ آج خلافِ معمول اس نے اپنے بالوں کو کس کر باندھ رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ بہت دبلا نظر آ رہا تھا۔

''ڈاکٹر ابارشن کرنے سے انکار کر رہی ہے۔'' اس نے رضا کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر رندھے ہوئے لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ''کہتی ہے چوتھا مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ بہت خطرناک بات ہے اس میں جان کا خطرہ ہے میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔''

دسمبر کے مہینے کی گہری خنکی کے باوجود رضا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے جھلملائے۔

''ڈرا رہی ہوگی تمہیں زیادہ چارج کرنے کے لیے۔'' رضا نے بمشکل جملہ پورا کیا۔

''نہیں پیسوں کی بات نہیں ہے۔ میں نے تو دس چوڑیاں اتار کر اس کے پاؤں میں رکھ دی تھیں۔ پر وہ کانوں کو ہاتھ لگا رہی ہے۔ کہتی ہے پولیس کیس بن جائے گا۔ میں اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالوں گی۔'' ''اب کیا کروں رضا؟''

اس کی سونے کی چوڑیوں والے جگمگاتے ہوئے ہاتھوں پر آنسوؤں کی دو بوندیں گریں۔ ”میں آپ کے حوصلے پر بیٹھی رہی۔ شروع ہی میں آجاتی تو...... آپ نے خود ہی کہا تھا اپنی امی سے بات کریں گے۔“

”میں نے اپنی بڑی آپا سے بات کی تھی۔“ رضا نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”آپا کہتی ہیں بڑے شاہ جی خود بھی مر جائیں گے اور تمہیں بھی گولی مار دیں گے۔ دلشاد تم میرے شاہ جی کو نہیں جانتیں بہت سخت گیر آدمی ہیں۔ بڑے بھائی صاحب کو جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اپنی مرضی سے شادی کرنے پر۔ حالانکہ وہ بیچاری تو ہماری کزن ہیں۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ پچھلے تین چار ماہ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ بڑے پرانے خیالات کا خاندان ہے ہمارا۔“ رضا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اگر چھپ کر نکاح کر لیں رضا۔ کسی کو بتائے بغیر۔“

”ایسی باتیں چھپا نہیں کرتیں۔ کوئی نہ کوئی بتا دے گا۔ قیامت آجائے گی۔ میری ماں تو شاید زندہ ہی نہ رہ سکے۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریض ہے۔“

”اچھا خیر کوئی بات نہیں۔“ دلشاد نے اس کا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔ یہ تو ایک خواب تھا خواب سچے تھوڑا ہی ہوتے ہیں رضا...... ”چلو باجی الماس پال لیں گی بچے کو ہمارے ہاں یہ کونسی انوکھی بات ہے...... پر میرے بچے کے شاہ جی آ کر اسے ملا تو کریں گے نا؟ دلشاد نے دونوں ہاتھوں سے رضا کے چہرے کو بہت نرمی سے تھام کر سوال کیا۔ اب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر زرد چادر میں جذب ہو رہے تھے۔

”بے وقوفانہ باتیں نہ کرو دلشاد۔ ابارشن بہت ضروری ہے۔ میرا بچہ اس طرح دنیا میں نہیں آ سکتا۔ میں اپنے خون کو اس ماحول میں پلتے بڑھتے نہیں دیکھ سکتا۔ ذرا سوچو اگر بچی ہو گئی تو...... میں تو خودکشی کر لوں گا۔ خدا کی قسم۔“

”بچہ تو آپ کا دنیا میں آ چکا ہے۔ چھوٹے شاہ جی۔“ دلشاد نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔

”یہ جذباتی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔“ رضا نے غصے اور ندامت سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔ پوچھو اس لیڈی ڈاکٹر سے کتنا مانگتی ہے۔ دس ہزار بیس ہزار میں دوں گا بس اس معاملے کو ختم کراؤ ورنہ کسی اور ڈاکٹر سے بات کرو۔ باجی الماس سے کہو فوراً...... اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے دلشاد تو......“

”اور اگر اس میں میری جان چلی جائے شاہ جی۔“

”بہت ایکسپرٹ ہوتی ہیں ڈاکٹر ان کاموں میں۔ ہزاروں کیسز کیے ہوتے ہیں اسی طرح کے انہوں نے۔ کچھ نہیں ہو گا تمہیں انشاء اللہ...... میں اب واپس چلوں دلشاد۔ شاہ جی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ فون کروں گا تمہیں دو چار دن تک۔“ رضا نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے جلدی سے کہا۔

وہ جب گھر واپس پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ عزاداری ٹولیوں کی شکل میں کھڑے ہو کر ہلکا ہلکا ماتم کر رہے تھے۔ ایک خوبصورت آواز والے لڑکے نے نیا نوحہ شروع کیا۔ ماتم کی لے تیز ہو گئی۔ رضا نے ماتم کے لیے سینے پر ہاتھ رکھا تو آنسوؤں کا ایک ریلا بہہ نکلا۔

اس رات اس کے آنسوؤں کو بہنے کے بڑے موقعے ملے۔ اس کی آپا نے جو محرم کے لیے میکے آئی ہوئی تھیں اپنے اکلوتے بیٹے کو امام حسین کا فقیر بنایا تھا۔

”رضا میرے چن میرے ویر“ انہوں نے چھ سالہ ابرار کی انگلی اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”اسے ساتھ لے جاؤ۔ پانچ چھ گھر پھرا لاؤ۔ قزلباشوں کی حویلی ضرور جانا انہوں نے اس کے لیے منت کے کپڑے بنوا کر رکھے ہوئے ہیں...... کسی غریب گھر بھی ضرور جانا۔ وہاں سے آٹا بھی مل جائے تو تبرک

ہے......سارا سال بیمار رہا ہے میرا بیٹا۔" انہوں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

رضا بچے کے ساتھ باہر آ گیا۔ ہر مرتبہ جب کسی گھر کا دروازہ کھلتا بچہ مسکین سی آواز میں اپنا رٹا ہوا سبق دہراتا۔ "مولا کا فقیر ہوں بڑا عاجز ہوں۔ غریب ہوں۔ میری مدد کرو را ہ مولا۔" لوگ بڑی عقیدت سے چھوٹے چھوٹے کاسے بھرتے اور پیسے ننھے سے فقیر کی جھولی میں ڈالتے۔ رضا منہ دوسری طرف کرکے اپنے آنسو پونچھتا۔

دوسرے دن اسے ہلکی سی حرارت ہوگئی تھی۔ وہ سارا دن اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ اس کے بھانجے نے ایک دو مرتبہ آ کر کہا۔ "ماموں آپ کا فون ہے کوئی باجی بول رہی ہے۔"

"انہیں کہہ دو رضا صاحب بیمار ہیں فون پر نہیں آ سکتے۔"

"خوب کی بڑے شاہ جی میرے ساتھ آپ نے خوب کی اس گلی کا پتہ آپ ہی نے مجھے بتایا تھا میں خود تو نہیں چلا گیا تھا وہاں" اپنی سرخ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے اس نے شاید دس مرتبہ دل میں دہرایا۔"

واقعی الماس باجی کے ہاں شاہ جی نے ہی اسے بھیجا تھا۔ سالانہ عرس کا دعوتی رقعہ پہنچانے کے لیے اس نے تو کئی مرتبہ کہا:

"شاہ جی مجھے شرم آتی ہے میں نہیں جاؤں گا وہاں منشی کو بھیج دیں۔"

"برخوردار میں ہر سال خود جاتا ہوں وہاں دعوت دینے۔ پر اب مجھ سے اتنی سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں۔ دم پھول جاتا ہے۔ منشی کے کہنے پر نہیں آئیں گی یہ لوگ کوئی پیسے تو نہیں لیتیں ہم سے۔ چوکی دینے آتی ہیں برخوردار۔ ساری رات کھڑی ہو کر چوکی دیتی ہیں۔ گا گا کر گلے بیٹھ جاتے ہیں بے چاریوں کے۔ رونق تو وہ ہمارے ہاں لگاتی ہیں ان کا کیا فائدہ اس میں۔ عزت کے ساتھ

بلانا پڑتا ہے ایسے موقعوں پر۔ بس تم صرف الماس کے ہاں چلے جاؤ اس کے کہنے پر باقی ساری خود ہی آ جائیں گی۔" رضا کو متذبذب دیکھ کر انہوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ذرا تحکم سے کہا "ہماری آدھی آمدنی اسی عرس سے ہوتی ہے اور پھر بیٹا میرے بعد تم نے ہی سنبھالنا ہے سارا کچھ۔ سیکھو ابھی سے۔" وہ سمجھ گیا کہ شاہ جی لیکچر دینے کے موڈ میں ہیں اور اب فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ "ٹھیک ہے شاہ جی۔"

دوسرے دن صبح کوئی دس گیارہ بجے کے قریب وہ باجی الماس کا گھر ڈھونڈنے نکلا۔ ساری گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ جس پان والے کی دکان کا حوالہ شاہ جی نے دیا تھا وہ بھی ابھی بند تھی۔ یہیں سے اسے الماس باجی کے کوٹھے کا پتہ پوچھنا تھا۔ ایک مجہول سا شخص جون کی چلچلاتی دھوپ میں گرم اوور کوٹ پہنے پان والے کے تھڑے پر بیٹھا کوئلے سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ حلیے سے بالکل دیوانہ اور خبطی معلوم ہوتا تھا۔ "الماس بیگم کے گھر کی سیڑھیاں کون سی والی ہیں۔" رضا نے اس سے پوچھا۔

"جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اترا۔" اس شخص نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں الماس کا گھر کون سا ہے۔" رضا نے اس بار ذرا غصے سے سوال کیا۔ "یہ شخص شاید مجھے بھی کوئی گاہک سمجھ رہا ہے۔" یہ سوچ کر اسے شرم سی محسوس ہوئی۔

اس دیوانے خبطی نے رضا کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھے نہیں پتہ اس کا کوٹھا کون سا ہے، میں تو دھوبی ہوں مجھے کیا پتہ۔ میں آپ کو بتاؤں میں دھوبی کیسے بنا۔" اس نے زمین پر ایک قلابازی

کھاتے ہوئے کہا۔

''میں کپڑے دھوتا رہا' دھوتا رہا خدا کی شان تو دیکھو میں دھوبی بن گیا۔'' یہ کہہ کر اس نے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال لیے اور بہت متانت سے گلی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ رضا مایوس ہو کر لوٹنے ہی والا تھا کہ پان والا دکان کھولنے آ گیا۔

''اس سے کیا پوچھ رہے ہیں یہ تو پاگل ہے۔ آپ شاہ جی کے بیٹے ہیں نا۔ عرس کا رقعہ دینے آئے ہوں گے' یہ سیڑھیاں الماس کو جاتی ہیں۔'' اس نے سامنے والے دومنزلہ سرخ مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' وہ شخص تیزی سے مڑا۔ میں شاعر ہوں۔

''ارشاد کیا ہے:

''حسین میر موچنا
یہ کہہ گئی سنوچنا
نہ لیپنا نہ پوچنا
زمیں پہ بیٹھے سوچنا
سنوچنا کے موچنے سے
بال اپنے نوچنا''

اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے رعب سے نظم سنائی۔

رضا کو ہنسی آ گئی۔ یہ نظم اسے اگلے کئی مہینوں میں بہت دفعہ سننی پڑی۔

الماس کے گھر کی بھاری بھاری چقیں گری ہوئی تھیں اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ سامنے بڑے سے صحن میں آٹھ دس نوجوان لڑکیاں جمع تھیں۔ کوئی سر میں تیل لگا رہی تھی اور کوئی پاؤں میں مہندی۔ ایک دو نلکے کے آگے بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھیں۔ وہ محجوب سا ہو کر تھوڑی دیر چپ چاپ

کھڑا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کس کو مخاطب کرے۔ اتفاقاً ایک بوڑھی سی عورت کمرے سے نکلی' رضا نے فوراً کہا۔ ''جی ذرا الماس باجی کو بلوا دیں۔'' یہ جملہ ادا کرتے ہوئے شرم کی وجہ سے اس کی آواز بہت نیچی نکلی۔

''ہائے میں صدقے آواز کتنی پیاری ہے۔'' نلکے کے آگے بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اگر ان کی مونچھیں نہ ہوتیں تو خود بھی بہت پیاری تھیں۔'' دوسری نے فقرہ کسا۔

''میں ان کو اپنا لال تاروں والا دوپٹہ نہ لا دوں۔ بڑی شرماہٹ آ رہی ہے۔ گورے گورے مکھڑے پر۔''

''بکواس نہ کرو نی۔'' اس بوڑھی عورت نے جو غالباً پرانی ملازمہ تھی لڑکیوں کو ڈانٹا۔ چھوٹے شاہ جی ہیں۔ رجب علی شاہ جی کے بیٹے۔ ادب کرو لحاظ کرو۔ عرس کا سدا لے کر آئے ہوں گے۔ اسی لیے آئے ہیں نا شاہ جی آپ؟'' بوڑھی نے ایک کرسی کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتے ہوئے بڑی نرمی سے پوچھا۔ رضا نے سر ہلایا۔ ''بیٹھیں۔'' اس نے کرسی آگے کی۔ ''دشمن بھاگ ہمارے کوٹھے کے۔ آج چھوٹے شاہ جی بھی سیڑھیاں چڑھے۔'' رضا نے رقعہ نکال کر عورت کو دیا اور رومال سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔

''میں الماس کو بھیجتی ہوں۔'' رضا بے آرامی کے ساتھ کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔ ایک اٹھارہ انیس سال کی خوبصورت اور نازک سی لڑکی چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے باہر آئی۔ اس نے ناک میں سبز اور سرخ نگوں والی چھوٹی سی نتھ پہن رکھی تھی۔ اس کی جھالر جیسی پلکوں والی شربتی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا جو ذرا عجیب سا لگ رہا تھا۔ لڑکی نے بہت ادب سے رضا کو چائے پیش کی۔ ''میں چائے نہیں پیتا۔'' رضا نے گھبراہٹ میں خواہ مخواہ کہہ دیا۔

"چائے نہیں پیتے یہ ہمارے گھر کی چیز کو حرام سمجھتے ہیں۔" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ رضا نے اس سے پیالی پکڑ لی۔ "میں الماس باجی کی چھوٹی بہن ہوں دلشاد۔ وہ نہا رہی ہیں ابھی آتی ہیں۔ ان سے مل کر جائیں کچھ بات کرنی ہے انہوں نے آپ سے...... آپ شاہ صاحب کے اکلوتے بیٹے ہیں نا...... باجی نے بتایا ہے۔" لڑکی نے گفتگو شروع کی۔ "نہیں میرا ایک اور بھائی ہے مگر وہ الگ رہتا ہے۔" رضا کو دکھ ہوا کہ بڑے شاہ جی بھائی صاحب کو عاق کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے اُن کا نام لینے کے روادار بھی نہیں ہیں۔ سارے گھر والوں کو بھائی سے چھپ کر ملنا پڑتا تھا۔ سوائے امی کے جو شاہ جی کی اجازت سے ان کے گھر بھی جا کر رہا کرتی تھیں۔

"کہاں پڑھتے ہیں آپ۔" لڑکی نے اسے چونکا دیا۔

میں ابھی ابھی ایک امتحان سے فارغ ہوا ہوں اور رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔ رضا کو کچھ یقین نہیں تھا کہ وہ لڑکی آئی۔ سی۔ ایم۔ اے کا مطلب سمجھ پائے گی یا نہیں چنانچہ جب اس نے پھر پوچھا "کونسی کلاس کا امتحان دیا ہے؟" تو رضا نے گول مول سا جواب دیا۔ "بس یہ ایک حساب کتاب والا امتحان ہے اگر کامیاب ہو گیا تو بڑی اچھی ملازمت مل جائے گی۔"

"مگر آپ تو بالکل چھوٹے سے لگتے ہیں۔" لڑکی نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"صرف لگتا ہوں۔" وہ ہنسا۔

"میں نے بھی میٹرک کیا ہوا ہے پرائیویٹلی۔" دلشاد نے آہستہ سے کہا۔ "پھر اس کے آگے کچھ نہیں۔" اس مرتبہ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

"آپ ایف۔اے بھی کر سکتی ہیں پرائیویٹلی' کتابیں منگوالیں بلکہ مضمون بتانے میں لا دوں گا آپ کو کتابیں۔" رضا نے ذرا زور دے کر کہا اور پھر

خود ہی جھینپ گیا۔ "میرا مطلب ہے کہ کتابیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔" اس نے ذرا سنجیدہ بننے کی کوشش کی۔

جب وہ واپس گھر آ رہا تھا تو بہت حیران تھا کہ آخر دلشاد میں ایسی کیا بات تھی کہ وہ اس سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ حد تو یہ ہوئی کہ الماس باجی سے ملنے اور انہیں رقعہ دینے کے بعد بھی وہ وہیں ان کے پاس بیٹھا رہا اور دنیا زمانے کی باتیں کرتا رہا۔ اس ایک گھنٹے میں اسے ایک مرتبہ بھی تو احساس نہیں ہوا کہ وہ ایک طوائف کے کوٹھے پر بیٹھا ہے اور ایک ناچنے گانے والی لڑکی سے مصروف گفتگو ہے۔

یہ پہلی ملاقات بہت آسانی سے آخری بھی ثابت ہو سکتی تھی مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایک عجب قسم کی سرشاری تھی جو اسے کبھی کتابیں پہنچانے اور کبھی نوٹس دینے کے بہانے وہاں جانے پر اکساتی رہی۔ ان فارغ دنوں میں کسی ریسٹورنٹ میں' بازار میں یا لائبریری میں' کبھی کبھی کالج کے پرانے دوستوں سے بھی اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ اسے یاد آیا کہ کالج میں اس کے ساتھ پڑھنے والے کئی رئیس زادے ان دنوں بھی رنڈیوں کے کوٹھے کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتے تھے اور کئی دفعہ الماس کا کوٹھا بھی موضوعِ گفتگو ہوتا۔ دلشاد کی نوخیز جوانی' دلکشی اور اس کی خوبصورت آواز کے چرچے ہوتے اور اس کے رقص کے نئے نئے انداز بھی بیان کیے جاتے۔ کئی مرتبہ اس کا عریاں لباس بھی زیرِ بحث آتا جو وہ رات کو اپنی محفلوں میں پہنا کرتی تھی۔ یہ قصے پچھلے دو تین برس میں اس کے ذہن سے تقریباً محو ہو چکے تھے اور اب دلشاد کو ملنے کے بعد دل کسی طریقے سے باور نہیں کرتا تھا کہ یہ وہی طوائف زادی ہے جس کی باتیں چٹخارے لے لے کر کی جاتی تھیں۔ اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ لڑکے جس دلشاد کا ذکر کرتے تھے وہ

اس سے مختلف تھی جس کو ملنے کے لیے وہ اکثر دن میں جایا کرتا ہے۔ جو سادہ کپڑوں میں ملبوس ایک سیدھی چوٹی کر کے نظریں جھکائے اس کے سامنے بیٹھی رہتی، جس کا کسی قسم کے ناز و انداز سے دور کا بھی تعلق نہیں لگتا تھا۔ اُس کی باتوں میں کبھی بھول کر بھی ناچ گانے کا ذکر نہیں آتا تھا۔ ایسی باتوں سے گریز دانستہ تھا یا نادانستہ رضا یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

شاید یہ سلسلہ کچھ دیر اسی طرح چلنے کے بعد خود بخود ختم ہو جاتا۔ خاص طور پر اس دن تو اس کے خاتمے کا قوی امکان تھا۔ جب بڑے شاہ جی کے ایک قریبی دوست نے اسے الماس بیگم کے گھر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاہ جی نے اس رات اسے اپنے کمرے میں بلا کر دھیمے لہجے میں کہا تھا'' بیٹا دوبارہ کبھی وہ سیڑھی نہ چڑھنا۔ وہ لوگ اگر سال میں ایک مرتبہ یہاں آ بھی جاتی ہیں تو آ کر ہم لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتی ہیں بس اتنی ہی حیثیت ہے ان کی۔ اس سے زیادہ مقام نہ دو انہیں۔ موری کی اینٹ ہیں...... آگے تم عاقل ہو بالغ ہو۔ میری طرف سے اتنا سن لو کہ میں اپنی عزت پر اولاد کی محبت بھی قربان کر دیا کرتا ہوں۔'' رضا نے چاہا کہ کہے شاہ جی سال میں ایک مرتبہ ہی، ہوتی تو رنڈیوں کی کمائی ہے اس سے آپ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آتا پھر اگر میں دلشاد سے ملنے چلا جاتا ہوں تو اس سے عزت کیوں مٹی میں مل جاتی ہے۔ مگر اسے یہ سوچتے ہوئے ایسا لگا جیسے اس کی یہ دلیل خود اسے بھی قائل کرنے میں ناکام ہو رہی ہے۔ اسے اپنے ذہن کے دوغلے پن پر شرمندگی سی ہوئی۔ اسے یاد تھا کہ شاہ جی کی اس بات کے بعد وہ آٹھ دس دن دلشاد کے ہاں نہیں گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ اور کچھ دن خود پر ضبط کر کے اپنے آپ کو روک سکے تو شاید یہ کہانی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

''مگر ایسا ہوا نہیں۔'' رضا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا۔

وہ شاید اپر مال کے کسی ریسٹورنٹ میں چائے پینے کے لیے گیا تھا جہاں اسے جلال مل گیا۔ جلال کالج میں ایک نہایت اوباش رئیس زادے کے طور پر مشہور تھا۔ اس کے باپ کی سرگودھا میں لمبی چوڑی زمینیں تھیں اور وہ خود کالج ہمیشہ Latest ماڈل کی گاڑی پر آیا کرتا تھا۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی۔ سو اس نے کالج کی کئی لڑکیوں کو بے وقوف بنانے کے بعد چھوڑ دیا تھا۔ اس نے رضا کو دیکھا تو تقریباً بھاگتا ہوا اس کے پاس آ گیا اور نہایت ایکسائیٹڈ لہجے میں کہا'' یار رضا بڑا اچھا ہوا تم اتنے عرصے کے بعد آج مل گئے۔ یار ایک مزے دار بات ہونے والی ہے وہ دلشاد یاد ہے...... جس کی باتیں میں تمہیں کالج میں سنایا کرتا تھا۔ یار وہ کوٹھے والی...... الماس کی چھوٹی بہن'' دلشاد کا نام سن کر رضا کے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا تھا۔ خون کی ایک گرم سی لہر سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جسم میں دوڑ گئی۔'' یار تمہارے ہاں تو عرس پر آتی تھی اتنی ایکٹنگ کیوں کر رہے ہو۔'' جلال نے اس کی پیٹھ پر ایک دھموکا مارا۔

''کیا ہوا اسے۔'' رضا نے ایسے لہجے میں سوال کیا جو کسی روبوٹ کے منہ سے نکلا ہوا فقرہ معلوم ہوتا تھا۔

''یار الماس بیگم دلشاد کی نتھ کھلوائی کے لیے پانچ لاکھ مانگ رہی ہے کیا کروں۔ چھوڑنا تو میں نے بھی نہیں۔ چاہے ابا سے چھپ کر سرگودھا والی کچھ زمین کیوں نہ بیچنی پڑے۔ پر ذرا جلدی انتظام کرنا پڑے گا۔ پانچ سات اور بھی اس میں انٹرسٹڈ ہیں۔ یار ایک تو وہ یاور ہے حیات والوں کا۔ اس کے لیے تو پیسہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ویسے میں نے الماس باجی سے وعدہ لیا ہے کہ میرا انتظار کرے۔ یار کریں گی نا؟ مجبوراً کریں گی۔ میں نے بڑا پیسہ کھلایا ہے ان لوگوں کو پہلے بھی۔ ہے نا ٹھیک بات۔'' اس نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی۔

جلال کے جانے کے بعد رضا کو تقریباً ایک گھنٹے تک کچھ پتہ نہیں چلا

کہ وہ کہاں بیٹھا ہوا ہے۔ دماغ میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور اعصاب ایسے تنے ہوئے تھے کہ جیسے اگر ابھی وہ کھڑا ہوا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہر طرف بکھر جائے گا۔ پھر وہ ایک مشین کی طرح اٹھا اور باہر آ گیا۔ باہر شام بہت گہری ہو چکی تھی۔ اس نے گاڑی کا رخ شاہی محلے کی طرف موڑا۔ آج اتنے مہینوں میں پہلی مرتبہ وہ دن ڈھلے دلشاد کے ہاں جا رہا تھا۔ وہ الماس باجی کے ہاں پہنچ کر بغیر ادھر اُدھر دیکھے سیدھا دلشاد کے کمرے میں گیا۔ وہ دری پر بیٹھی نوٹس تیار کر رہی تھی۔ اس کے سر پر رولرز لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں پر مہندی جیسے کسی رنگ سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ سامنے اس کے بیڈ پر ایک دھانی رنگ کی پشواز اور ٹشو کا دوپٹہ پڑے تھے جو غالباً کوئی استری کر کے وہاں رکھ گیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جیسے حیران رہ گئی۔

''آپ اس وقت یہاں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں کیا تمہارے مجرے کی تیاری میں مخل ہو رہا ہوں۔'' رضا نے انتہائی طنزیہ اور کٹیلے لہجے میں کہا۔ ''اور ان کتابوں میں کیوں اپنی جان کھپا رہی ہو تمہیں کہیں پروفیسر تو نہیں لگنا۔ مبارک ہو تمہیں جلال تمہاری نتھ کھلوائی کے لیے پانچ لاکھ کا انتظام کرنے سرگودھا گیا ہے۔''

شاید پہلی مرتبہ دلشاد سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں اتنی تلخی آئی تھی جس پر وہ فوراً پشیمان بھی ہو گیا۔ کیونکہ اُس کے اس فقرے نے جیسے دلشاد کے چہرے کا سارا لہو نچوڑ لیا۔

''رضا میں پروفیسر بن بھی گئی تو کہلاؤں گی تو ہیرا منڈی کی ہی نا۔'' دلشاد نے اپنی آواز کی لرزش کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''میری ایک کزن یہیں لاہور کے کالج میں پڑھاتی ہے۔ نیلم نام ہے اس کا۔ اس نے چھوڑ دی تھی یہ زندگی۔ ایک ہاسٹل میں رہ کر پڑھتی رہی۔ پچھلے پانچ

سال سے پڑھا رہی ہے مگر اب بھی جب کالج میں اس کا ذکر ہوتا ہے تو پڑھانے والیاں آپس میں کہتی ہیں۔ وہ ہیرا منڈی والی نیلم۔ بے چاری کی دو دفعہ منگنی ٹوٹ چکی ہے۔ لوگ اس کے ماضی کا پتہ لگا لیتے ہیں۔'' اب اس کی آواز میں دکھ اور غصہ دونوں تھے۔ ''آپ کو پتہ ہے باجی مجھ سے بہت ڈرتی ہیں ان کو اندیشہ ہے کہ کہیں میں بھی نیلم کی طرح گھر سے بھاگ نہ جاؤں۔ صرف اس ڈر کی وجہ سے وہ آپ کو یہاں آنے سے روکتی بھی نہیں کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ میں آپ سے......'' دلشاد کی آواز رندھ گئی۔ ''کیا یہ ہم دونوں کے لیے کافی نہیں۔''

''دلشاد تیاری کرو۔'' باہر سے الماس باجی کی آواز آئی۔ ''ارے اندر کون بیٹھا ہے یہ تو اپنے چھوٹے شاہ جی ہیں۔'' الماس باجی نے اندر آ کر رضا کا منہ چومتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہوئی مردوں والی بات شاہ جی۔ یہ کیا کہ دن کو منہ چھپا کر آئے اور چلے گئے۔ آج آپ بہت اچھے دن پہ آئے ہیں ابھی دس بجے آپ کو ایک زبردست چیز دکھائیں گے۔ میری بھانجی ہے شعلہ۔ اس نے استاد تھو خان سے نیا نیا تھک سیکھا ہے۔ آج وہ رنگ لگائے گی محفل میں۔ کیا غضب کا ناچتی ہے۔'' الماس نے بہت دلداری سے کہا۔ پھر شاید اس نے رضا کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کی اور بولی ''فکر نہ کریں آج ہم نے بڑے خاص خاص لوگوں کو بلایا ہے کوئی ایرا غیرا نہیں آئے گا۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مجرے والے کمرے میں لے گئی ''یہاں بیٹھیں شاہ جی۔'' انہوں نے ایک نہایت خوبصورت دبیز کے گاؤ تکیے کے پاس اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔

سفید چاندنی پر گاؤ تکیوں کے سہارے آٹھ دس ادھیڑ عمر کے اوباش قسم کے مرد بیٹھے وہسکی سے دل بہلا رہے تھے۔ طبلے اور سارنگی والے اپنی سُریں ٹھیک کرنے میں مصروف تھے۔ کمرے میں موتیے کے پھولوں' سگریٹوں اور وہسکی کی ملی جلی مہک تھی۔ ایک طبلے والے نے رضا کو وہسکی کا گلاس پیش کیا۔

"میں نہیں پیتا۔" اس نے ذرا جھینپ کر گلاس پرے کیا۔ "بادشاہو پینے کو کون کہتا ہے چکھ لیں ذرا۔" طبلے والے نے بہت بے تکلفی سے گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ "دل ہلکا ہو جائے گا۔" ایک انجانی کیفیت میں رضا نے گلاس پکڑ لیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی جیب بالکل خالی ہے۔

"یہ صبح کی ملاقات نہیں رات کی محفل ہے، جس میں پیسے دیے کر بیٹھا جاتا ہے۔" یہ سوچ کر شرم سے اس کے پورے جسم میں ایک سنسناہٹ سی ہوئی۔ اس نے الماس باجی کو اشارے سے پاس بلایا "باجی میں خالی ہاتھ آ گیا ہوں اور یہاں تو...... رضا نے ان کے کان میں بہت دھیمی سی آواز میں کہا۔ "میں صدقے میں واری پیسے آپ سے اچھے ہیں۔ آپ بے فکر ہو کر بیٹھیں شاہ جی موج کریں آپ۔ غلام ہیں ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ پیسے دینے کے لیے یہ مچھندر جو بیٹھے ہیں۔" الماس باجی نے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں فتح مندی کی چمک تھی۔

ایک بارہ تیرہ برس کی دبلی پتلی معصوم سی لڑکی چوڑی دار پاجامے اور ململ کے کرتے پر مخمل کی ستاروں والی واسکٹ پہنے ہوئے اندر داخل ہوئی اور جھک کر اہلِ محفل کو سلام کیا۔ رضا کو اس کے چہرے پر بچوں جیسی گھبراہٹ نظر آئی۔ لڑکی نے رقص شروع کیا اور وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں شروع کر دیں۔ سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹ ایک دوسرے کے گریبان میں ڈالے جاتے اور لڑکی سے انہیں نکالنے کا اشارہ کیا جاتا۔ وہ نوٹ نکالنے آتی تو نوٹ کو اور نیچے کر دیا جاتا۔ وہ کھسیا کر واپس آ جاتی اسے پھر بلایا جاتا۔ اس مرتبہ نوٹ کسی کے سر پر رکھا جاتا۔ لڑکی جلدی سے نوٹ چھین کر طبلے والوں کے پاس پھینکتی۔ نشہ تیز ہونے کے بعد محفل میں بہت دھما چوکڑی مچی۔ ایک صاحب نے لڑکی سے واسکٹ اتارنے کے لیے کہا۔ لڑکی نے دونوں

ہاتھوں سے واسکٹ بہت مضبوطی سے پکڑ لی۔ "یہ نہیں اتاروں گی۔" اس نے الماس باجی کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ایک صاحب لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے اور زبردستی جا کر واسکٹ اتار دی۔ بچی کا چھوٹا سا ناپختہ سینہ ململ کی قمیض سے جھلکنے لگا۔ اہلِ محفل نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔ رضا کو ابکائی سی آئی۔

اس رات پہلی مرتبہ وہسکی کے تیز نشے میں رضا کا دلشاد کے ساتھ جسمانی تعلق قائم ہوا پانچ لاکھ ادا کیے بغیر اور حیرت اُسے اس پر تھی کہ الماس باجی بالکل خاموش رہیں۔ دلشاد کے ساتھ یہ رشتہ جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا تھا یا محض اپنی انا کی تسکین کے لیے یہ بات رضا کو خود بھی کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن قدرت نے بہت جلد وضاحت کر دی کہ جسمانی رشتہ کچھ بھی سوچ کر قائم کیا جائے نتیجہ ایک ہی رہے گا۔ مگر جب دلشاد نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے تو فکر اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ ایک انجانا سرور بھی تھا جو رضا نے محسوس کیا۔ "ہم شادی کر لیں گے۔ دلشاد بے فکر رہو۔" ہر دفعہ جب وہ یہ فقرہ اس سے کہتا تو اس کا دل اور جسم اس کا پورا پورا ساتھ دیتے مگر ذہن اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا رہتا۔ یہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کتنی مضبوط تھی اس کا احساس اسے اس دن ہوا جب اس کی آپا نے پوری بات سن کر کہا "رضا تمہاری خیر نہیں۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ "یہ میرا دوپٹہ دیکھو۔" انہوں نے اپنا دوپٹہ اس کے قدموں میں ڈالتے ہوئے کہا "رضا ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔" "تم کہو تو اس لڑکی کے پاؤں پر بھی جا کے اپنا دوپٹہ رکھوں۔ عزت کا واسطہ دوں۔ پھر تو پیچھا چھوڑ دے گی ناں۔ تمہیں پتہ ہے بڑے شاہ جی کی طبیعت۔ انہیں عزت کتنی پیاری ہے۔"

سب کچھ سمجھنے کے باوجود نہ جانے کیوں وہ تین چار ماہ اپنے دل کو اور دلشاد کو یہ جھوٹی تسلیاں دیتا رہا کہ نوکری ملنے کے بعد وہ بڑے شاہ جی سے

زیادہ کھل کر بات کر سکے گا۔

دلشاد سے آخری ملاقات کے بعد دس دن ایک عجیب ادھیڑ بن میں گزر گئے۔ زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے۔ وہ شاید سگریٹ ہی پینے کے لیے گھر سے باہر نکلا تو بڑے شاہ جی سامنے سے آتے نظر آئے۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں معلوم ہوتے تھے۔ ''مبارک ہو بیٹا اب تم بیشک کراچی والی آفر ٹھکرا دو یہاں لاہور کی بہت بڑی فرم سے تمہاری سلیکشن کا لیٹر آ گیا ہے۔'' انہوں نے کھلا ہوا ایک خاکی لفافہ اسے پکڑایا۔ ''اللہ کا شکر ہے اتنی دور نہیں جانا پڑے گا۔ گھر والوں کی آنکھوں کے سامنے رہو گے خوش ہونا اب تو۔'' انہوں نے پر امید نظروں سے اسے دیکھا۔

''مگر شاہ جی میں کراچی جانا چاہتا ہوں وہاں میرے لیے زیادہ ایونیوز ہیں بہت اچھی فرم ہے وہ۔ مجھے کچھ عرصے کے لیے جانے دیجئے وہاں۔''

شاہ جی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا ''مگر تم تو کہتے تھے لاہور سے باہر نہیں نکلنا مجھے۔ اب یہ اچانک تبدیلی۔'' ''شاہ جی میں نے بتایا نا مجھے اپنا کیریئر دیکھنا ہے۔'' رضا نے ذرا اونچی آواز میں جواب دیا۔

جس دن وہ کراچی جانے کے لیے سامان باندھ رہا تھا تو اسے اپنے آپ پر بہت حیرانی ہوئی۔ ایک عجیب قسم کی آزادی کا احساس دلشاد کے غم کو اوور لیپ کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ آزادی کا یہ احساس ان تمام برسوں میں دلشاد کے غم کے ساتھ ساتھ رہا جو اس نے سندھ، بلوچستان اور سرحد میں گزارے تھے۔ شاہ جی اور ماں اس کے مستقل طور پر پنجاب واپس آنے کا خواب دل ہی میں لے کر دنیا سے رخصت ہوئے یوں بھی سندھی خاندان کی شمس آرا سے شادی ہونے کے بعد کراچی تو اسے بالکل اپنا گھر ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

''چائے بنا کر دے آیا ہوں جی۔'' ملازم کی آواز نے رضا کو ایک بار پھر زمانہ حال میں لا کھڑا کیا۔ ''میرا سگریٹ اور لائٹر لے آؤ۔'' رضا نے ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ سرکاتے ہوئے کہا۔

باجی الماس اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ رضا نے سلام کیا۔ وہ بے تابی سے دو ایک قدم اس کی طرف بڑھیں اور پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر واپس جا کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ رضا کو وہ زیادہ بوڑھی تو نہیں لگیں البتہ اس نے دیکھا کہ ان کا برقعہ بہت گھسا ہوا اور پرانا تھا۔

''چھوٹے شاہ جی آپ نے تو ہمیں بالکل بھلا ہی دیا۔'' انہوں نے بہت محبت سے کہا۔ ''نہیں بھلایا نہیں'' رضا نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی پوری پوری کوشش کی ''بس اتفاق ایسا ہوا کہ میرا لاہور آنا ہی بہت کم رہا نوکری کے بعد اور پھر شاہ جی اور بی بی کے رخصت ہونے کے بعد تو یقین کریں کہ بس کبھی کبھار ہی چکر لگتا تھا۔''

''جی مجھے پتہ ہے۔ بڑے شاہ جی کا بڑا افسوس ہوا...... پچھلے ماہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ خیر سے ایک سال سے یہاں لاہور میں ہیں اور ماشاء اللہ کسی بہت بڑے عہدے پر ہیں۔'' رضا خاموش رہا۔

''ہم لوگ تو آپ کو ہمیشہ بہت یاد کرتے رہے ہیں' دلشاد تو ابھی مجھے ادھر آتے دیکھ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے شاہ جی کے بچوں کو دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔'' ''ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں آپ کے۔'' باجی نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

''دو بیٹیاں ہیں دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔ چھوٹی عمر میں بیاہ دی تھیں ہم نے' امریکہ میں ہوتی ہیں۔ ان کی ماں بھی وہیں گئی ہوئی ہے آج کل ان سے ملنے۔'' رضا نے بہت ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ دلشاد کے نام کے ساتھ جو لمحہ سنسناتا ہوا تیر بن کر آیا تھا اب گزر چکا تھا۔

''خدا خوش رکھے آباد رکھے۔'' باجی نے برقعہ اتار کر صوفے پر رکھتے ہوئے بہت اطمینان سے کہا۔

''دلشاد کیسی ہے۔'' رضا کے منہ سے یہ جملہ کیوں اور کیسے نکلا وہ خود بھی نہیں سمجھا۔

''زیادہ ٹھیک نہیں ہے وہ۔ شاہ جی۔ بہت کمزور ہوگئی ہے جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ آپ کا بڑا غم کیا اس نے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''بیچاری آپ کی ایک تصویر کو اکثر دیکھا کرتی ہے۔ دیکھیں نا کوئی نشانی بھی تو نہیں رہی آپ کی اس کے پاس۔ آپ کی اولاد اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ بیچاری کو چھٹا مہینہ تھا جب سیڑھیوں سے گری۔ کئی دن بے ہوش رہی۔ بچہ پیٹ میں مر گیا۔''

رضا نے آنکھیں جھکا لیں۔

''ایک بیٹا ویسے ہے دلشاد کا۔'' ان کی آواز رندھ گئی۔ ''رانا صاحب میں سے۔ آپ کو یاد ہیں نا رانا صاحب۔ گورے سے دبلے سے بہت آیا کرتے تھے ہمارے ہاں۔ مر گئے وہ بھی بے چارے۔''

رضا نے آنکھیں اٹھا کے باجی الماس کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ ''ایک عرضی لے کر آئی ہوں آپ کے پاس شاہ جی۔ دلشاد کے بیٹے کی۔'' انہوں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''اس بچے کو کہیں نوکروں میں بھرتی کروا دیں۔ دسویں پاس کی ہوئی ہے اس نے..... شاہ جی دلشاد کی قسمت میں سکھ نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا اس لڑکے کو یہ ہمارے کام کو برا سمجھتا ہے۔ سارا دن کمرے میں بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہم سے بولتا چالتا بھی نہیں۔ آگے پڑھائی میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ پتہ نہیں کیا سوچتا رہتا ہے۔ صحت بھی ٹھیک نہیں اس کی۔ ہم نے تو اسے بچپن میں انگریزی سکول میں داخل کروایا تھا۔ وہاں

ایک دن کسی بچے نے حرامی کہہ کر چھیڑ دیا۔ بس پھر سکول نہیں گیا پرائیویٹ دسویں کی ہے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکیں۔

رضا نے پھر آنکھیں جھکا لیں۔

''میں نے پچھلے سال ٹیکسی لے کر دی تھی اسے کہ چلو چار پیسے اس طرح کما لے۔'' باجی نے دوبارہ بات شروع کی۔ پر کیا بتاؤں اسے بھی ٹکریں مارتا پھرتا تھا سارا دن۔ دھیان ہی کہیں اور رہتا تھا اس کا..... دلشاد نے چھڑوا دیا یہ کام بھی ڈر کے مارے۔ آپ اسے کسی دفتر میں لگوا دیں چلو اپنے جوگا ہو جائے گا۔ بے شک الگ ہو جائے ہم لوگوں سے۔ ہمیں تو اس کی خوشی چاہیے۔ دیکھیں شاید ماحول بدلے تو ٹھیک ہی ہو جائے..... یہ کام کر دیں شاہ جی۔ اپنے بچوں کے صدقے' باجی نے اٹھ کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے باجی'' رضا نے ان کا ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹایا'' اگلے ہفتے بدلی ہونے والی ہے میری پھر کراچی۔ مگر آپ فکر نہ کریں میں اپنے ایک دوست کا پتہ آپ کو دیتا ہوں۔ میرا نام لیجیے گا اس سے۔ وہ آپ کا یہ کام ضرور کر دے گا اور باجی اب آئندہ سے آپ میرے اس دوست ہی سے رابطہ رکھیں۔'' رضا نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

سمجھوتا

ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد سامنے صحن میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آئی وہ سفید چبوترے پر بنا ہوا ایک کنواں تھا جو صحن کے عین وسط میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ممتاز نے گھبرا کر اپنے دونوں بیٹوں کی انگلیاں پکڑ لیں۔ سب سے چھوٹی بچی زہرا باپ کی گود میں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے شوہر کی طرف سراسیمہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''شوکت ہمیں یہاں کتنے دن رہنا پڑے گا۔ اتنے چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں اور یہ کنواں دیکھ رہے ہو اوپر سے کھلا ہوا۔''

''بچے اس کنویں تک نہیں پہنچ سکتے تاجی' پہلے اتنی چوڑی چوڑی آٹھ سیڑھیاں چڑھو تو پھر کہیں کنویں کی شکل نظر آتی ہے اور وہ سامنے سرونٹ کوارٹر ہے۔ جس چوکیدار نے ابھی گیٹ کھولا تھا وہ اسی میں رہتا ہے اور سارا دن کرسی ڈالے اس خوبانی کے درخت کے نیچے بیٹھا رہتا ہے۔ اب میں تو پچھلے ایک ماہ سے یہاں ہوں۔ یہاں کے سب معمولات سے واقف ہو چکا ہوں گھبراؤ نہیں۔'' شوکت نے اسے تسلی دی۔

لیکن ڈرپوک اور وہمی طبیعت کی تاجی نے دل میں کہا۔

''یہ تو کوئی اچھا شگون نہیں لگتا۔''

قصرِ زریں تھا اس ریسٹ ہاؤس کا نام۔ ممتاز کو یاد آیا اور واقعی ایک محل ہی کی طرح تھا..... کمشنر صاحب نے اجازت دے دی ہے کہ جب تک ہمیں پوسٹنگ نہیں ہو جاتی ہم اس ریسٹ ہاؤس میں رہ سکتے ہیں۔ اور ہاں تاجی پانچ کمرے ہیں اس میں۔ یہ دور فون کر کے شوکت نے اسے بتایا تھا' اصولاً تو ہمیں صرف ایک بیڈ روم ملنا تھا لیکن یہ بھی انہیں کی مہربانی سے ہوا کہ ہمارے ہوتے ہوئے اس میں اور کوئی مہمان نہیں ٹھہرایا جا سکے گا۔''

تاجی شوکت کی آواز میں خوشی کی جھلک دیکھ سکتی تھی۔

ممتاز اس فون کے تیسرے دن بچوں کو لے کر کوئٹہ آ گئی تھی۔ کوئٹہ میں بہت سے پرانے جاننے والے مل گئے جن سے شام کو گھروں میں ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جب کوئی شوکت سے پوچھتا کہ آپ کی پوسٹنگ نہیں ہوئی ابھی تک تو دونوں میاں بیوی شرمندہ سے ہو جاتے جیسے اس میں ان کا کوئی قصور ہو۔

بہر حال اچھا وقت گزر رہا تھا اور غالباً انہیں وہاں رہتے ڈیڑھ ماہ ہوا تھا جب ایک دن شوکت نے دفتر سے آ کر کہا۔

''اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ میرے آرڈر ہو گئے ہیں۔ کہاں کے ہوئے ہیں یہ کوئی نہیں بتا رہا۔ غالباً کوئٹہ سے باہر بھیج رہے ہیں۔ خدا جانے کہاں جانا پڑے گا۔ بلوچستان میں تو ایک سے ایک بڑھ کر گاڈ فارسیکن جگہیں موجود ہیں۔ تاجی یہ جو عرصہ انتظار کا پیریڈ یہاں گزر رہا ہے مجھے تو بڑا غنیمت نظر آیا۔''

تاجی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ باہر دروازے پر گھنٹی بجی' شوکت ایک سرکاری لفافہ کھول کر کچھ پڑھتا ہوا اندر آیا۔

''بیگم صاحبہ آپ کو پوسٹنگ کا بڑا شوق تھا مبارک ہو مجھے ڈی سی سبیلہ پوسٹ کر دیا گیا ہے۔ سمجھ اب آئے گی آپ کو...... مزاج ٹھکانے آ جائیں

گے۔'' شوکت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب'' تاجی نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔

''آج کل 114 ڈگری ٹمپریچر ہے وہاں کا۔ بجلی ابھی وہاں آئی نہیں۔ سنا ہے کہ ڈی سی کے گھر پر ایک جنریٹر موجود ہے جو دو گھنٹے شام کو چلایا جا سکتا ہے۔ گویا کالا پانی۔''

''کچھ ہو نہیں سکتا اس پوسٹنگ کو رکوانے کا۔'' تاجی نے پوچھا۔

''چیف سیکرٹری صاحب بڑے سخت آدمی ہیں۔ دراصل پچھلے دنوں ان کی بیٹی کے ساتھ بہت بڑا حادثہ ہوا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے یہیں کہیں بلوچستان میں شادی ہوئی تھی اس کی۔ بیٹی کی مرضی تھی وہاں...... کہتے ہیں لڑکے کو نشے کی عادت تھی۔ پیسے ویسے مانگنے کے لیے بیوی کو باپ کے پاس بھیجنا چاہتا تھا اس نے انکار کیا تو آئرن راڈ سے بے چاری کا سر توڑ دیا۔'' ممتاز کو جھرجھری سی آئی۔

''اس دن کے بعد سے اب بڑے صاحب بیچارے اللہ والے ہو چکے ہیں۔ داڑھی رکھ لی ہے اصول پرست ایسے کہ جو کہہ دیا کہہ دیا۔ سوا اب اس آرڈر کو پرائم منسٹر صاحب بھی نہیں بدل سکتے۔ بہرحال تیاری کرو۔ ہم کل صبح لسبیلہ کے لیے نکل جائیں گے۔

''پہلے حب چلنا'' شوکت نے ڈرائیور سے کہا۔ ''وہاں کے ریسٹ ہاؤس میں جا کر چائے پئیں گے۔ بھئی تاجی یہ علاقہ بھی ہماری عملداری میں ہے۔ ڈی سی کا ایک دفتر اتھل (لسبیلہ) میں ہے اور دوسرا یہاں حب میں۔ تمہارے لیے خوشخبری یہ ہے کہ یہاں سے کراچی بس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔'' حب کے سرکاری ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے شوکت نے بتایا۔

''جناب یہاں کا SHO آپ کو سلام کرنے کے لیے انتظاری میں ہے۔ بُلا لوں اگر آپ اجازت دیں۔'' ایک ملازم نے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''تاجی تم کمرے میں جاؤ۔''

''نہیں باہر برآمدے میں بٹھاؤ میں آ رہا ہوں۔'' شوکت نے کہا۔

''چائے تو پی لیں۔'' تاجی نے آواز دی۔

''آ کر پیتا ہوں۔''

اچانک باہر سے تاجی کو شوکت کی اونچی اونچی آواز میں بولنے کی آواز آئی۔

''پھاڑ کر پھینک دیں اس خط کو اور آپ بھی جائیں کام کریں اپنا۔'' شوکت پولیس والے سے کہہ رہا تھا۔

''کیا ہوا'' شوکت کے اندر آتے ہی تاجی نے پوچھا ''خیریت ہے نا۔''

''ہاں ہاں خیریت ہے کوئی فکر کی بات نہیں تم آرام کرو۔''

''آپ نے کسی خط کا ذکر کیا تھا اس آدمی سے ابھی تو آپ نے جوائن بھی نہیں کیا اور کام کاج پہلے ہی شروع ہو گئے۔''

''جوائن کرنے سے ہی منع کیا گیا ہے۔'' شوکت نے آدھے مذاق اور آدھے سنجیدگی کے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یہاں لیٹر بکس میں کوئی گمنام خط ڈال کر چلا گیا ہے میرے نام جس میں لکھا ہے کہ اگر میں نے وہاں جا کے یہ عہدہ سنبھالا تو میرے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ میں کسی مقامی آدمی کا حق نہ ماروں۔'' اور چونکہ یہ خط بغیر لفافے کے تھا اس لیے یہ ایس۔ایچ۔او اسے پڑھنے کے بعد یہاں لایا تھا۔''

"یہ تو بڑی ڈراؤنی بات ہوئی۔" تاجی نے سہم کر کہا۔

"ایسی باتیں یہاں ہوتی رہیں گی ان کو زیادہ خاطر میں لانے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ تم اپنا اور میرا جینا حرام کردو گی۔ میں ملازم کو بلواتا ہوں تم بچوں کو گاڑی میں بٹھاؤ چلیں اتھل۔

ایک بے آب و گیاہ علاقے سے گزرنے کے بعد کچھ پرانی سی عمارتیں نظر آئیں۔ سفید رنگ کے ایک سنگ میل پر اتھل آٹھ میل لکھا ہوا تھا اس کے پاس ہی سامان کی چار گٹھڑیاں ایک کے اوپر ایک کرکے رکھی گئی تھیں۔ تاجی کو خیال آیا کہ وہ پیچھے تمام راستہ اسی قسم کی ایک دوسری پر رکھی گٹھڑیاں دیکھتی آرہی ہے۔

"یہ کس کا سامان ہے۔" اس نے ڈرائیور سے پوچھا "جو یہاں راستے میں رکھا ہوا ہے۔ سامان کے ساتھ کوئی آدمی تو نظر نہیں آتا۔"

"سرجی یہ سامان امانت ہے اس کو کوئی نہیں اٹھائے گا۔ چار چیزوں کی ڈھیری بنائی جاتی ہے اللہ رسول کے نام پر۔ پھر اسے کوئی نہیں چھیڑتا۔ چاہے ایک مہینہ پڑی رہے۔"

"اسے کوئی چوری نہیں کرتا۔"

"بیگم صاحب ادھر چوریاں نہیں ہوتیں اور اس ڈھیری سے تو لوگ بہت ڈرتا ہے سر پر کوئی عذاب نہ آجائے۔" تاجی نے تعجب سے شوکت کی طرف دیکھا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شوکت نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ "میں نے جن صاحب سے چارج لینا ہے وہ تین سال یہاں کے ڈی سی رہے ہیں۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ پچھلے دس برس سے اتھل کے تھانوں میں چوری کی کبھی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی۔"

تاجی کو اس وقت تو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن لسبیلہ کے ڈی سی ہاؤس میں پندرہ دن گزارنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ اگر وہ اپنی ہیرے کی انگوٹھی بھی باہر صحن میں رکھ آئے تو وہ ساری زندگی وہیں پڑی رہے گی۔ کیا بھولے اور معصوم لوگ ہیں کتنے اچھے۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو کر سوچا کرتی کاش انسان کا گزارہ صرف لوگوں کی سادہ لوحی اور معصومیت ہی سے ہو جایا کرتا مگر ڈھنگ کی زندگی گزارنے کے لیے اور بھی بہت سے لوازمات اس زمانے میں ضروری ہیں جو سب یہاں ناپید ہیں۔ وہ دل ہی دل میں افسوس کرتی۔ پوری تپتی ہوئی دوپہر برف کی سلوں سے ٹھنڈے کیے ہوئے کمرے میں مٹی کے تیل سے چلنے والے بدبودار پنکھے کے سامنے لیٹ کر گزاری جاتی۔ شام کو چھ سے آٹھ بجے تک کے لیے جنریٹر چلانے والا آتا۔ بجلی کے بلبوں میں مدھم سی روشنی آجاتی پنکھے آہستہ آہستہ گھومنے لگتے اور گھر کے تمام ملازم بھاگ بھاگ کر بہت سے رکے ہوئے وہ کام کرنا شروع کر دیتے جو بجلی کے مرہونِ منت ہوتے۔ سارا دن گرمی میں بے سدھ پڑی ہوئی تاجی تینوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر کمپاؤنڈ میں لگا ہوا تھوڑی دیر کے لیے چلنے والا فوارہ دکھا لاتی۔ سومیانی کے ساحل سے آئی ہوئی تازہ مچھلیاں برف سے بھرے ہوئے ٹبوں میں رکھ کر جب اندر لائی جاتیں تو وہ تاسف سے ان کی طرف دیکھتی۔ فریج اور فریزر کے نہ چلنے کی وجہ سے انہیں بس اسی دن استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال انہیں جلدی جلدی پہرے داروں اور ملازموں میں تقسیم کیا جاتا جسے وہ انہی دو گھنٹوں میں پکا کر اپنی پیٹ پوجا کا بندوبست کرتے۔ اس کا باورچی بھی دبے پاؤں چلتا ہوا آتا اور رات کے کھانے کے متعلق ہدایات لینے کے لیے تاجی کے سامنے مؤدب کھڑا ہو جاتا۔ اسی طرح کے بہت سے ادب آداب اور وہ رعب اور دبدبہ جو وہاں کے ڈپٹی کمشنر کے عہدے کے لیے مختص تھا اسے دیکھ کر تاجی کو کچھ ندامت سی ہوا کرتی۔ ہر دفعہ

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے جب آٹھ سپاہیوں کی گارد انہیں ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ کرتی تو وہ ہمیشہ آنکھیں نیچے جھکا لیتی۔ مگر یہ سب کچھ اس کی مرضی سے نہیں ہوتا تھا۔

''یہاں ڈی سی کو بادشاہ سلامت سمجھا جاتا ہے۔'' شوکت نے اسے ایک دفعہ بتایا کہ ''ڈی سی یہاں کا مائی باپ ہے سنا ہے لورالائی کے ڈی سی صاحب تو بادشاہوں کی طرح تالی بجا کر ملازم کو بلاتے ہیں۔ جیسے پچھلے زمانے میں حاکم وقت ہوتے تھے جن کے غلط حکم پر بھی کسی کو سرتابی کی مجال نہیں ہوتی تھی۔ شوکت نے ذرا افسردہ سے لہجے میں کہا۔

اس بات کی سچائی کا اندازہ اسے ایک دن اس وقت ہوا جب وہ جیپ میں اُتھل کے بازار میں سے گزر رہی تھی۔ جیپ جب چوک کے نزدیک پہنچی تو ایک درمیانی عمر کی غریب عورت ہاتھ جوڑ کر اس کے عین سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ تاجی نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

''پوچھو اس سے کیا کہتی ہے۔''

ڈرائیور نے نیچے اتر کر براہوی زبان میں اس عورت سے کچھ باتیں کیں۔

''بیگم صاحبہ یہ بولتی ہے کہ پہلے ڈی سی صاحب کے گھر پر کپڑے یہ دھویا کرتی تھی لیکن اب آپ نے کوئی اور ملازمہ رکھ لی ہے۔ یہ التجا کر رہی ہے کہ اسے واپس رکھ لیا جائے۔''

''اس کا نام کیا ہے۔''

''مہراں ہے جی اس کا نام۔''

''مگر مجھے تو بتایا گیا تھا کہ مہراں مرگئی ہے۔ ایک دو ملازموں نے کہا تھا اسی لیے میں نے نئی عورت کا انتظام کیا ہے۔'' تاجی نے بہت حیران ہو کر کہا۔

ڈرائیور نے یہ بات اس عورت کو بتائی اس نے آگے سے رو رو کر کوئی جواب دیا۔

بیگم صاحب یہ بولتی ہے ''میں نہیں مری ہوں ان ملازموں نے جھوٹ بولا ہے۔''

''تم نے اسے کیا جواب دیا ہے؟'' تاجی نے پوچھا۔

''میں نے بولا ہے جی اس کو کہ جب ڈی سی صاحب کی بیگم بولتا ہے کہ تم مرگیا ہے تو بس تم مرگیا اب کس لیے آیا ہے۔ آپ کا حکم ہے جی۔''

تاجی نے دیکھا وہ عورت ڈرائیور کی یہ بات سننے کے بعد بالکل لاجواب ہوگئی اور بے بسی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ گویا پوچھ رہی ہو کیا میرے دوبارہ زندہ ہونے کا حکم ہوسکتا ہے۔

''اسے بولو کل سے کام پر آجائے میں دونوں کو رکھ لوں گی۔''

تکلیف اور راحت کے اس برزخ میں اسی طرح دن گزر رہے تھے تاجی اپنے آپ کو پڑھنے لکھنے میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔ شاید اس دن بھی وہ کوئی کتاب لے کر لان میں جانے والی تھی کہ گیٹ پر سے بہت سے آدمیوں کی زور زور سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تین چار پولیس والے ایک زخمی آدمی کو جس کے کپڑے خون میں تر بتر تھے اٹھا کر لا رہے تھے۔ انہوں نے اسے چبوترے پر اگی ہوئی گھاس پر ایک لاش کی طرح لٹا دیا۔ ایک آدمی دوڑا ہوا اندر آیا اور باورچی سے پانی کا گلاس لے کر باہر چلا گیا۔ تاجی گھبرا کر باہر نکل آئی۔ اسے دیکھ کر وہاں پر جمع سرکاری اہلکاروں اور پولیس والوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ تاجی نے دیکھا تیس پینتیس برس کا گہری سانولی رنگت کا ایک آدمی جس کے گلے میں گولی لگی ہوئی تھی زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ کبھی کبھی خون کے بلبلے اس کی گردن سے نکلنا

شروع ہوجاتے۔ ایک ملازم نے اس کا منہ کھول کر اسے زبردستی پانی پلایا پھر اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنے اردگرد کھڑے ہوئے مجمعے کو دیکھا۔ پھر بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو اٹھا کر اپنے منہ تک لایا اور کچھ آہستہ سے کہا۔

''روٹی مانگتا ہے۔'' ملازم نے مجھ سے کہا۔

''یہ کھائے گا کیسے اس کی تو گردن میں گولی لگی ہوئی ہے۔'' دوسرا بولا۔

اس آدمی نے پھر کچھ بولنے کی کوشش کی۔ ایک آدمی نے اپنا کان اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔

''بیگم صاحب میں اس کو روٹی لا دوں۔ بولتا ہے میں کھالوں گا۔'' اس نے اجازت طلب لہجے میں پوچھا۔

اب تاجی میں اس دلخراش منظر کو دیکھنے کی تاب نہ رہی تھی۔ اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے کہا۔

''روٹی نہیں اسے دودھ لا کر پلاؤ۔''

وہ اپنے تینوں بچوں کو پلنگ پر بٹھائے انہیں باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ ان میں سے کوئی باہر جانے کی ضد نہ کرے۔ جب ایک ملازم اندر آیا اور بولا۔

''بیگم صاحب وہ دودھ نہیں پیتا تھا ہم اس کو روٹی دیا پتہ نہیں کیسے کیسے ہوئے گلے کے ساتھ کھانے لگا ایک بات بولوں بیگم صاحب وہ آٹھ دن سے بھوکا تھا۔'' یہ کاغذ اس کی جیب سے نکلا ہے۔

ایک بہت میلے سے مڑے تڑے کاغذ پر براہوی میں زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جسے ظاہر ہے تاجی پڑھ نہ سکتی تھی۔ البتہ تحریر کے آخر میں شکستہ سی اردو میں

جو تاریخ درج تھی وہ 8 جون 1974ء تھی۔ بس تاجی اسی حصہ کو سمجھ سکی۔

''اس خط میں کیا لکھا ہے۔'' اس نے ملازم سے استفسار کیا۔

اس میں لکھا ہے ''دو بوری گندم ہمارے آدمی کو دے دو تمہارا روپیہ پندرہ تاریخ سے پہلے ادا کر دیں گے۔''

''نیچے لکھنے والے کا نام نہیں ہے۔''

''جی نہیں بیگم صاحب۔''

''یہ کون ہے۔'' تاجی نے پوچھا۔

''بیگم صاحب اسی قبیلے کا ہے جی۔ جو پہاڑوں پر چھپا ہے۔ یہ ادھر جا کر حکومت کے خلاف جنگ کرتا ہے۔ باغی ہوگیا ہے بیگم صاحب یہ ابھی۔ بہت بڑا پہرہ ہے نیچے اب ان کو راشن نہیں پہنچ سکتا۔ یہ نیچے آٹا لینے کے لیے اترا تھا۔ گشت والوں نے گولی ماری ہے۔ اچھا بیگم صاحب آپ کے لیے کھانا لگاؤں۔'' وہ ساتھ ہی بولا۔

''جاؤ مجھے بھوک نہیں۔'' تاجی نے کہا۔

''تمہاری یہ بھوک ہڑتال کتنے دن رہے گی۔'' شوکت نے تاجی سے پوچھا۔ ''آج چوتھا روز ہے وہ آدمی ٹھیک ہوگیا ہے بھئی ہسپتال میں ہے۔ حکومت کے خلاف محاذ آرائی میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے۔ ابھی بھی تیس آدمی پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہمارے مخبر نے بتایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا اوپر سردار کا سب سے چھوٹا بیٹا بہت بیمار ہے اسے نمونیا ہوگیا ہے۔ تم یقین کرو تاجی میں نے بڑے پیغامات بھیجے ہیں کہ بچے کو کسی کے ہمراہ بھیج دے میں اس کا علاج کرواؤں گا اور یہ بھی ضمانت دی تھی کہ اسے واپس بھجواؤں گا۔ مگر ان لوگوں نے میرا اعتبار نہیں کیا۔ وہ سمجھتے ہیں یہ بھی کوئی چال ہے حکومت کی۔ مرجائے گا بے چارہ بچہ بغیر

علاج کے وہیں پہاڑوں پر۔ دراصل آج کل سختی بھی بہت ہوگئی ہے۔ رات کو بھی پہرہ رہتا ہے۔ لوہے کی باڑ بھی لگی ہے کہ ان کا کوئی ساتھی راشن لے کر اوپر نہ جاسکے۔ اب تو کئی بھوک سے بھی مر رہے ہوں گے بیچارے۔"

"پھر آپ مجھے یہ بھی کہتے ہیں کہ میں بھوک ہڑتال ختم کروں مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔"

تاجی نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

کسی نے بیڈروم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"صاحب جی آپ کی دفتر کی ڈاک ہے ادھر دے دوں۔"

"ہاں لے آؤ۔" شوکت نے کہا۔

آج وہ دفتر سے ذرا جلدی گھر اٹھ آیا تھا۔ ڈاک کھول کر پڑھتے ہوئے اچانک ایک خط کو الگ رکھ کر شوکت نے بیڈروم میں لگی ہوئی گھنٹی دبائی۔

"جا کر ڈاک والے کلرک کو بلا کر لاؤ دفتر سے۔" اس نے ملازم سے کہا۔

"کیوں کیا ہوا۔" تاجی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" شوکت نے غصے سے جواب دیا۔

"پھر اس خط کو پڑھتے ہوئے آپ کا رنگ کیوں بدل گیا ہے۔" تاجی نے وہ خط اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بڑی شکستہ سی اردو میں کسی نے کالے نب سے لکھا ہوا تھا۔ ڈی سی صاحب بہادر۔ یہاں سے اپنی بدلی کروا لو ورنہ تم پچھتاؤ گے۔ تمہارے بچے بھی ہمارے بچوں کی طرح گھاس کھائیں گے۔ ساری زندگی ڈھونڈو گے مگر ان کی شکل نہیں دیکھ سکو گے۔ ابھی موقع ہے چلے جاؤ۔ نیچے لکھا تھا۔ تمہارا خیر خواہ۔

"میں اب ایک منٹ کے لیے بھی یہاں نہیں رکوں گی۔ بچوں کو لے کر

لاہور چلی جاؤں گی۔" تاجی نے تقریباً لرزتے ہوئے کہا۔

"تاکہ بلیک میل کرنے والوں کو حوصلہ ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہی چاہتی ہو نا تم جنہوں نے کچھ کرنا ہوتا ہے وہ خط نہیں لکھا کرتے۔ میں تو تمہارے ڈر سے عاجز آ گیا ہوں۔ اب دیکھو نا افتخار کی عمر میں تو بچے کو سکول داخل ہونا چاہیے تم انہیں کمرے سے باہر نہیں نکلنے دیتی ہو۔ خیر فکر نہ کرو میں پتہ چلا لوں گا یہ خط کس نے لکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں دفتر واپس جاؤں ابھی سارا عملہ وہیں ہے...... تم آرام کرو۔ گھبراؤ نہیں۔ باہر گیٹ پر دس آدمی بندوقیں لیے کھڑے ہیں کسی کی مجال ہے اس گھر کے قریب پھٹکنے کی کوشش کرے۔"

"آج پتہ تو چل گیا ہے کہ خط لکھنے والے موصوف کون ہیں۔" شوکت نے اس واقعہ کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد تاجی کو بتایا۔

"کون ہے وہ۔" تاجی نے بے تابی سے پوچھا۔

"ایک بہت بڑا سردار ہے یہاں کا۔ پہلا خط بھی اسی نے لکھا تھا۔"

"وہ ایسا سب کیوں کر رہا ہے۔" تاجی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس میرا یہاں آنا ان کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہو رہا۔ سردار امید علی نام ہے۔ بڑی بھاری زمینوں والا آدمی ہے۔ یوں تو میں نے سنا ہے اپنے علاقے میں بڑی عزت ہے اس کی بڑا دبدبہ بڑا رعب ہے۔ پر اب ہم کیا کریں سردار صاحب تین چار کیسوں میں پولیس کو مطلوب ہیں اور آج کل تو کسی دوسرے زمیندار کے قتل میں دھر بھی لیے گئے ہیں۔ میرے آنے سے پہلے پولیس نے کبھی انہیں پکڑا نہیں تھا۔ خیر چھوڑو تم ان باتوں کو۔ کل ہفتہ ہے بچوں کو لے کر حب چلتے ہیں وہاں سے کراچی کا بھی ایک چکر لگا آئیں گے تم کوئی

کپڑے وپڑے خرید لینا اپنے لیے۔ ذرا دل بہل جائے گا۔"

ان کی گاڑی ابھی شاید خب کے ریسٹ ہاؤس سے دو میل دور ہی تھی کہ جب ایک پولیس والے نے دور سے سیلوٹ کیا اور جیپ کے ڈرائیور کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے شوکت کی طرف دیکھا۔

"روکو گاڑی اور پوچھو کیا کہتا ہے۔" پولیس والا جیپ کے رکتے ہی تقریباً بھاگتا ہوا آیا اور شوکت کے کان میں کچھ کہا جو تاجی نہ سمجھ سکی۔

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں جاؤ تم۔ ڈرائیور گاڑی چلاؤ۔"

"کیا بات ہے شوکت۔" تاجی نے پوچھا "کیا کہتا ہے یہ پولیس والا۔"

دراصل میرے خب پہنچنے کی اطلاع وہاں لوگوں کو مل گئی ہے۔ علاقے کے کچھ معزز لوگ سردار امید علی کی ضمانت کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ پولیس والا اس کی اطلاع دینے آیا تھا۔"

"کوئی ڈراؤنی بات تو نہیں۔" تاجی نے پوچھا۔

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں مل لوں گا ان لوگوں سے۔"

جیپ ریسٹ ہاؤس کے اندر داخل ہوئی تو سفید کپڑوں میں ملبوس دس پندرہ آدمی شوکت کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھے۔

"آپ لوگ گول کمرے میں بیٹھیں میں آتا ہوں۔ تاجی تم اپنے والے کمرے میں بچوں کو لے کر چلی جاؤ۔"

تاجی نے بچوں کو اتارا جیپ سے کمرے تک کا فیصلہ طے کرتے ہوئے اسے ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں میں بالکل جان نہیں ہے۔ اس مسلسل خوف کی زندگی سے تو کسی چپڑاسی کی بیوی ہونا زیادہ بہتر ہے۔ تاجی نے غصے اور

بے بسی سے دل میں کہا۔ تھرماس میں سے ایک گلاس پانی پینے کے بعد اس نے کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ باہر صحن میں سے بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ اکا دکا آدمی ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اچانک ایک سرکاری جیپ گیٹ میں داخل ہوئی دو تین باوردی پولیس والے اس میں سے نیچے اترے اور کسی آدمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لانے میں مدد کرنے لگے۔

تاجی نے دیکھا وہ آدمی سفید رنگ کے بے داغ شفاف اور کلف شدہ شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک ہتھکڑی سے اکٹھے بندھے ہوئے تھے۔ غالباً اسی لیے پولیس والوں نے اسے ہاتھ پکڑ کر جیپ کے پائیدان سے اتارا تھا۔ وہ پینتالیس اور پچاس کے لگ بھگ ہوگا گورا چٹا اونچا لمبا انتہائی وجیہہ اور رعب دار شخصیت۔ جب وہ ڈرائنگ روم میں جانے کے لیے اس کی کھڑکی کے بالکل قریب سے ہو کر گزرا تو اس نے دیکھا کہ اس کے کرتے کے گلے پر ہیرے کے بڑے بڑے بٹن لگے ہوئے تھے۔

"بیگم صاحب چیف منسٹر صاحب اُدھر اچانک اُتھل کے دورے پر آ گیا اور ڈی سی صاحب کو انہوں نے سلام بولا تھا تو صاحب ان کی طرف چلا گیا ہے۔ وہ بول گیا ہے دو گھنٹے تک واپس آئے گا آپ کھانا مانا کھائیں۔" ایک ملازم نے تھوڑی دیر کے بعد اسے آ کر اطلاع دی۔

"یہ باہر ڈرائنگ روم میں کس کو لے کر آئے ہیں۔"

"جناب سردار امید علی کو۔ جو ان کے ضمانتی آئے ہیں انہوں نے ڈی سی صاحب کا اجازت نامہ لے کر سردار صاحب کو ادھر بلوایا ہے۔"

"ادھر کیوں بلوایا ہے۔"

"جناب ڈی سی صاحب ضمانتیوں کے سامنے سردار صاحب سے بات کرنا چاہتا ہے۔ پر ابھی کیا کرے گا اس کو تو چیف منسٹر صاحب کی طرف جانا پڑ

گیا۔ وہ ان لوگوں کو ادھر بیٹھنے کے لیے بول گیا ہے۔"

تاجی کو وہاں کے چیف منسٹر ہمیشہ بہت بھلے آدمی معلوم ہوئے۔ انتہائی سادہ اور بے تکلف۔ ان کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ سو بہت دفعہ وہ اپنے سائلوں اور شوکت کے ہمراہ اچانک اُتھل والے ڈی سی ہاؤس میں آ نکلا کرتے تھے۔ وہیں گرمی سے تپے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر پسینے میں شرابور وہ سائلوں کی بھیڑ میں گھرے ہوئے ان کی عرضیوں پر کچھ لکھتے رہتے۔ ایسے دنوں میں تاجی کو احساس ہوتا کہ گیلی لکڑیوں سے چولہا کیسے جلتا ہے اور بے چارے ملازم کس مشکل سے بھڑ بھڑاتی آگ جلا کر پندرہ منٹ کے اندر سو آدمیوں کے لیے چائے بناتے ہیں۔ تاجی کبھی کبھی گھبرا جاتی اور کہتی۔

"پیالیاں تو صاف کرو۔ کیسی گندی پیالیاں لے کر اندر جا رہے ہو۔ چیف منسٹر صاحب کیا سوچیں گے۔"

اس کا باورچی جو ڈی سی ہاؤس میں پچھلے کئی برس سے کام کر رہا تھا۔ اس کی طرف بہت تسلی دینے والی نظروں سے دیکھتا اور کہتا۔

"بیگم صاحب گھبراؤ نہیں۔ وہ درویش آدمی ہے کچھ نہیں بولتا۔ آپ ادھر گرمی میں کیوں کھڑا ہے جاؤ آرام کرو۔ سب انتظام ہو جائے گا۔"

پنجاب کے سیٹ اپ کے مقابلے میں تاجی کو یہ سب کچھ بہت عجیب لیکن اچھا لگا کرتا۔

"آپ کو معلوم ہے بیگم صاحب یہ سردار صاحب بھی پہاڑ والے باغیوں کو راشن پہنچاتا ہے۔ پولیس نے پتہ چلا لیا ہے۔"

تاجی ملازم کی بات سے چونکی اور اس کی طرف دیکھا۔

"اور ایک بات بتاؤں بیگم صاحب۔" ملازم نے بہت رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "سردار صاحب کوئی سمجھوتا نہیں ہونے دے گا سرکار کے ساتھ۔"

اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح تاجی کے ذہن میں لپکا۔

"تم نے کیا کہا تھا ڈی سی صاحب کب تک واپس آئے گا۔" اس نے ملازم سے پوچھا۔

"اس کو دو ڈھائی گھنٹہ ضرور لگ جائے گا۔ بیگم صاحب انشاءاللہ۔"

کبھی کبھی اپنے دل کی بات پر اعتماد کر لینا چاہیے۔ سنا ہے کوئی نقصان نہیں ہوتا تاجی نے سوچا اور ملازم سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سردار صاحب سے بولو وہ کھانے کے کمرے میں آ کر بیٹھیں۔"

اس نے حیران ہو کر تاجی کی شکل دیکھی۔

"جی اچھا بیگم صاحب۔"

پانچ منٹ کے بعد ایک پولیس والا جو غالباً وہاں کا ایس ایچ او تھا تاجی کے کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ وہ باہر نکلی تو بولا۔

"بیگم صاحب آپ نے سردار صاحب کو کھانے کے کمرے میں بٹھانے کا حکم دیا ہے۔"

"بالکل میں نے کہا ہے۔"

"جی ان کو اس کمرے میں بٹھا دیا ہے آپ کے حکم کے مطابق۔"

تاجی نے اپنے سفری بیگ میں سے سفید بوسکی کی بڑی سی چادر نکالی۔ اس سے اپنے آپ کو اچھی طرح سے ڈھانپ لیا۔ چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھایا اور دونوں بیٹوں کو انگلی سے لگا کر کھانے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ سردار صاحب ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے دو پولیس والے مؤدب کھڑے تھے۔ تینوں نے تاجی کو تعجب سے دیکھا۔ سردار صاحب نے کھڑے ہو کر تاجی کے سلام کا جواب دیا۔

"سردار صاحب مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا ہے۔ میں

آپ کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتی ہوں۔ اور ایسا سمجھیں کہ ایک بہن بھائی کے پاس اپنی کوئی بات کرنے آئی ہے۔''

سردار صاحب نے پیچھے مڑ کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔

''آپ لوگ ذرا دومنٹ کے لیے کمرے سے باہر جائیں۔'' تاجی نے پولیس والوں سے کہا۔

وہ فوراً مڑے اور باہر نکل گئے۔

''سردار صاحب'' تاجی نے جلدی سے بات شروع کی۔ ''شوکت صاحب سرکاری ملازم ہیں۔ گورنمنٹ جہاں بھیج دیتی ہے انہیں ادھر جانا پڑتا ہے اور بیوی بچوں کو بھی ساتھ رکھنا ایک مجبوری ہوتی ہے۔ میں آپ کو اپنا بھائی سمجھ کر اتنی درخواست کرنے آئی ہوں کہ ہمیں کسی سے کوئی ذاتی عناد یا دشمنی نہیں ہے۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں' قانون کے محافظ ہیں۔ آپ جو بھی سمجھیں بس اتنا خیال رکھیں کہ اگر میری جگہ آپ کی بہن اور بچے اتنے ڈر اور خوف میں دن گزار رہے ہوتے تو آپ کے دل پر کیا گزرتی۔ میں اپنے معصوم بچوں کو لان تک بھی کھیلنے کے لیے باہر نہیں بھیج سکتی۔ بڑے کو سکول میں نہیں داخل کروایا کہ کوئی وہاں سے اغوا نہ کر لے۔ نہ میں اچھی طرح کھانا کھا سکتی ہوں نہ سو سکتی ہوں۔ بس سارا دن سہمے ہوئے گزر جاتا ہے۔ دعائیں مانگتی رہتی ہوں کہ اللہ شوکت کو بھی ہر نقصان سے بچائے۔'' باوجود ضبط کے تاجی کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اس کی چادر پر گرے۔

''آپ نے مجھے بھائی بولا۔ آج سے آپ میری بہن ہو'' سردار صاحب نے بہت پر یقین لہجے میں کہا۔ ''بالکل بے فکر ہو جاؤ بہن۔'' انہوں نے تاجی کے بڑے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس آج سے میرا آپ کا ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ ہم عورت کی بہت عزت کرتے ہیں۔ آپ نے میری عزت کی ہے میں

آپ کی بات کی عزت رکھوں گا۔ اب آپ حفاظت میں ہیں جائیں بچوں کو سکول داخل کرائیں۔ کھائیں پئیں' آرام سے سوئیں' شوکت صاحب کی طرف سے بھی بے فکر ہو جاؤ۔ یہ ایک بلوچ سردار کا اپنی بہن سے وعدہ ہے۔''

سردار صاحب کھڑے ہو گئے اور پولیس والے کو آواز دی۔

''مجھے واپس ڈرائنگ روم میں لے جاؤ۔'' انہوں نے اندر آنے والے دونوں پولیس کے سپاہیوں سے کہا۔

''اور ہاں' بہن اپنا گورنمنٹ سے تو جھگڑا ملگڑا ہے وہ تو چلے گا۔ آپ اس کو بے فکر ہو کر چلنے دو۔'' دروازے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے پیچھے دیکھا اور مسکرائے۔

اگر نامہ بر ملے

گھر کے تھوڑے بہت کام نمٹانے کے بعد گھڑی کی طرف نظر کی۔ گیارہ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اب جمعرات کی افطاری پر مدعو کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو فون کرنے تھے۔ درزی سے اپنے کپڑے لانا تھے اور مالی سے لان کی کیاریاں ٹھیک کرانا تھیں مگر پہلے فون..... جمعرات کو کیا تاریخ ہوگی؟ ذرا سوچا مجھے تو آج کی تاریخ بھی یاد نہیں.....اس کے بھلکڑ ذہن نے بڑی معصومیت سے اسے بتایا۔ لاؤنج کی میز پر پڑا ہوا اخبار اٹھایا۔ سوموار بارہ فروری......یعنی پندرہ ہوگی جمعرات کو۔ اب پرس میں سے ڈائری نکال کر فون نمبروں پر نگاہ ڈالی۔ عمران رضوی اور بیگم......دروازے پر گھنٹی ہوئی ڈائری واپس رکھی اور دروازہ کھولا۔ گھسا پٹا میلا کچیلا اوور کوٹ پہنے ایک لاغر سا مفلوک الحال شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ پاؤں میں ربڑ کے چپل جن میں سے میل سے لتھڑی ہوئی زرد انگلیاں جھانک رہی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' غزالہ نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

اس وقت عام طور پر ڈائریاں اور پنسلیں بیچنے کے بہانے بھیک مانگنے والے آیا کرتے تھے یا کسی فرضی مسجد کے لیے چندہ مانگنے والے فراڈی......

''السلام علیکم جی! آپ مسز سلمان ہیں نا۔ سلمان صاحب تو کورٹ

چلے گئے ہوں گے؟''

''وہ تو کورٹ چلے گئے ہیں مگر گھر میں دو ہٹے کٹے ملازم ضرور موجود ہیں۔'' غزالہ نے آئے دن کے دہشت ناک واقعات کے پیشِ نظر اسے ڈرایا۔

''آپ غلط سمجھی ہیں، میں کوئی چور اُچکا نہیں ہوں۔ میں تو آپ سے ایک بہت ضروری بات''......

''جلدی بولو، مجھے گھر میں بہت کام ہے۔ ماں بیمار ہوگی، بھائی کی فیس دینا ہوگی، یہی بات ہے نا، آ جاتے ہیں تنگ کرنے صبح صبح۔''

غزالہ نے غصے سے کہا اور اندر سے کچھ پیسے لانے کے لیے مڑی۔

''باجی ٹھہریں میری بات سنیں۔ میں بھک منگا نہیں۔ آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس وہ دینے آیا ہوں۔''

''اچھا تو یہ کوئی جادو ٹونے کا تعویذ دینے آیا ہے مجھے۔'' غزالہ دل ہی دل میں ہنسی ''کیا امانت ہے میری بتاؤ؟'' اس نے یونہی تفریح طبع کے خیال سے کہا۔ چھپکلی کی شکل والا وہ آدمی غزالہ کے بالکل قریب آ گیا اور سرگوشی میں بولا۔

''باجی آپ کا شادی سے پہلے نصیر صاحب سے چکر تھا نا، جب آپ نوجوان تھیں، اس وقت کی ایک تصویر ہے میرے پاس آپ دونوں کی، ذرا ایسی ویسی قسم کی۔'' خوف اور حیرانی کی ایک لہر غزالہ کے پورے جسم میں دوڑی، اس آدمی نے اس کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو بڑے غور سے دیکھا۔

''باجی میں اس لان والی کرسی پر ذرا بیٹھ جاؤں، بہت بیمار ہوں، کھڑا نہیں ہوا جا رہا مجھ سے۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ ابھی ابھی یرقان سے اٹھا ہوں نا، آپ میری آنکھیں دیکھیں، بالکل پیلی ہیں۔'' اس نے بہت لجاجت سے کہا اور پیلے پیلے دانت نکال کر خوشامدی ہنسی ہنسا۔

''بیٹھ جاؤ'' الفاظ خود بخود غزالہ کی زبان سے نکلے، پھر ایک عجیب

طرح کی نقاہت نے خود اسے بھی ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے پر مجبور کیا۔

''دکھاؤں تصویر؟ کوئی ڈر فکر کی بات تو نہیں ہے نا؟'' اس نے چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے غزالہ سے پوچھا۔

''دکھاؤ'' غزالہ نے کہا۔

اس آدمی نے اوورکوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سالن کے داغوں سے بھرا ہوا ایک غلیظ لفافہ نکالا۔ اس میں سے بہت احتیاط کے ساتھ ایک تصویر برآمد کی اور ذرا دور سے غزالہ کو دکھائی۔

تصویر میں اُس کی محبت کا ایک خوبصورت لمحہ بڑی معصومیت سے مسکرا رہا تھا۔ اس حقیقت سے قطعی بے خبر کہ وہ اب ایسے بدصورت اور ظالم وقت کی گرفت میں تھا جو اس پر گناہ کبیرہ کی مہر ثبت کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

''کون ہو تم؟ یہ تصویر تمہیں کہاں سے ملی؟ کیا چاہتے ہو؟'' غزالہ نے موت کے اس فرشتے سے سوال کیا۔

''باجی آپ ڈریں نہیں، گھبرائیں نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں آپ کو تنگ کرنے نہیں آیا۔ آپ کی تصویر بھی واپس کر دوں گا۔ بالکل محفوظ ہے یہ میرے پاس۔ پندرہ برس سے میرے پاس پڑی ہے۔ بس آپ کو میری کچھ مدد کرنا ہوگی۔'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غزالہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کتنے پیسے مانگتے ہو اس کے؟ میں زیادہ نہیں دے سکتی، ہم لوگ تو بس سفید پوش ہیں اور پھر اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم اس کی دوسری کاپی لے کر دوبارہ نہیں آؤ گے میرے پاس؟'' غزالہ نے چھپکلے کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

باجی قرآن لے آئیں، اس پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤں گا کہ اس کے بعد آپ کو کبھی اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ میں زیادہ نہیں مانگتا۔ مجھے آپ کے مالی

حالات کا پتہ ہے۔ پچاس ہزار دے دیں۔ میں بڑی مجبوری کی حالت میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ کو کیا پتہ میں یہاں تک کیسے پہنچا ہوں؟ ڈاکٹروں نے مجھے جواب دے دیا ہے۔ میرے پھیپھڑے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ ایک حکیم کہتا ہے وہ میرا علاج کر سکتا ہے۔ پر اس کا علاج بڑا مہنگا ہے۔ آپ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ آپ کے پیارے پیارے بچے ہیں۔ خدا انہیں ہر آفت سے بچائے۔ بس ان کا صدقہ سمجھ کر یہ پیسے دے دیں۔

''یہ تصویر تمہیں ملی کہاں سے۔ تم نے بتایا نہیں۔'' غزالہ نے دل ہی دل میں اپنی نئی بنوائی ہوئی سونے کی چوڑیوں کی مالیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''سچ سچ بتا دوں، میں کسی زمانے میں لوگوں کی جیبیں کاٹتا رہا ہوں، خیر اب تو تائب ہو گیا ہوں۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا ''نصیر صاحب ایک دفعہ پلازا سینما میں ٹکٹ خرید رہے تھے تو میں نے ان کی جیب کاٹی تھی اُن کے بٹوے میں سے یہ تصویر نکلی۔ مجھے بڑی پیاری لگی، بالکل مدھوبالا، دلیپ کمار فلم ترانہ میں۔ میں نے سنبھال کر رکھ لی۔'' وہ شرارت سے ہنسا۔

غزالہ نے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے فوراً سنجیدہ سی شکل بنالی اور پھر بات شروع کی۔

''پیچ میں سعودی عرب چلا گیا تھا۔ وہاں آٹھ سال رہا، اب واپس آ گیا ہوں وہیں رہتا تو اچھا تھا۔ یہاں آ کر تو مجھے نشے کی لت بھی پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ایک ڈاکٹر صاحب نے چھڑوائی ہے ویسے باجی میں نے حج بھی کیا ہوا ہے، تین عمرے بھی کیے ہیں۔'' اس نے ذرا فخر سے کہا۔

غزالہ دم سادھے اس کی بے ربط باتیں سنتی رہی۔

''پچھلے ماہ میری ماں مر گئی تو میں گاؤں گیا تھا۔ وہاں میرے پرانے

صندوق میں سے یہ تصویر نکلی‘ میں نے سوچا شاید یہ تصویر میری جان بچادے۔‘‘

’’تم مجھے کیسے جانتے ہو؟‘‘ غزالہ نے سوال کیا۔

میں تو آپ کو‘ نصیر صاحب کو‘ سلمان صاحب سب کو جانتا ہوں‘ بڑی تاڑ رکھتا ہوں لوگوں کی۔ کام کاج تو کوئی ہے نہیں میرے پاس۔ سلمان صاحب کو تو بڑے زمانوں سے جانتا ہوں۔ تب تو وہ چھوٹے موٹے وکیل ہوتے تھے نا۔ اس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔ انہوں نے دو تین مرتبہ میری ضمانت بھی کرائی تھی‘ وہ مجھے جانتے ہیں‘ قیوم ہے میرا نام۔‘‘

’’نصیر صاحب کو کیسے جانتے ہو؟‘‘ غزالہ نے پوچھا۔

باجی پہلے میں چوبرجی میں رہا کرتا تھا۔ آپ اور نصیر صاحب چوبرجی کی ایک کوٹھی میں چھپ کر ملا کرتے تھے‘ یاد ہے نا‘ ایک دفعہ ایک غنڈے نے آپ کو وہاں سے نکلتے دیکھ کر چھیڑا بھی تھا۔ میں نے اس کی ناک پر مکا مارا تھا۔ تب میں بڑا تگڑا ہوا کرتا تھا۔ آپ لوگ تو فوراً ڈر کر بھاگ گئے تھے‘ میری اور اس غنڈے کی بڑی لڑائی ہوئی تھی بعد میں‘ دیکھیں باجی اگر کوئی کسی سے محبت کرتا ہے تو کرے‘ دوسروں کو کیا؟ ایسے ہی تھانے دار بنے پھرتے ہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا تھا اس پر۔ اچھا اب میں چلتا ہوں‘ اس نے اچانک کہا اور ہاں باجی میں بلیک میلر نہیں ہوں آپ کی عزت کا خیال ہے مجھے‘ ڈرتا ہوں کہیں سلمان صاحب ہی نہ آجائیں کچہری سے جلدی اٹھ کر‘ آج پیر ہے‘ آپ کل کے دن میں پیسوں کا انتظام کرلیں‘ بدھ کو سلمان صاحب کے جانے کے بعد مجھے اس نمبر پر فون کرلیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اور غزالہ کو دیا۔

’’تصویر اسی وقت آپ کے حوالے کردوں گا‘ مگر بدھ سے زیادہ ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔‘‘ غزالہ نے خالی خالی نظروں سے فون نمبر پڑھا۔

تیس ہزار کی چوڑیاں بکیں۔ دس ہزار بینک اکاؤنٹ کی جھاڑ پونچھ کے بعد نکلے۔ دس ہزار اس کی ایک پرانی سہیلی زیب نے یہ کہہ کر دیئے‘ مارچ میں واپس کردینا‘ لوگوں کی کمیٹیاں ہیں اور یہ اتنا زیور خریدنے کی کیا سوجھی ہے‘ ابھی پچھلے ماہ تو تم نے چوڑیاں بنوائی تھیں۔ ’’یہ والا سیٹ مجھے بہت پسند آگیا ہے۔‘‘ غزالہ نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ زیب کو اعتماد میں لے کر ساری بات بتادے‘ اس کا خاوند پولیس میں ہے۔ مزا چکھادے گا حرامی کو۔ مگر پھر جیسے اس کی چھٹی حس نے بتایا کہ اس کارروائی میں بہت بڑی گڑبڑ ہونے کا احتمال ہے‘ سارا کھیل ختم ہوجائے گا۔ ارادہ بدل دیا۔

صدیوں پر محیط یہ دو دن آخر کار گزر گئے۔ ’’وقت میں ایک یہی خوبی ہے کہ گزر جاتا ہے۔‘‘ غزالہ نے سوچا۔ بدھ کی صبح نو بجے کے قریب کورٹ روانہ ہونے سے پہلے سلمان کو اچانک اپنے کچھ ضروری کاغذات ڈھونڈنے کا خیال آگیا۔ الماریاں کھولتے بند کرتے دس بج گئے۔ مگر غزالہ کے بے ہوش ہونے سے پہلے کاغذات مل گئے۔ دس بج کر بیس منٹ پر فون نمبر نکالنے کے لیے پرس کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ غزالہ کا سارا جسم کانپا۔ ریسیور اٹھا کر بمشکل ’’ہیلو‘‘ کہا۔

’’مسز سلمان بول رہی ہیں؟‘‘ کسی بہت ہی مہذب مردانہ آواز نے پوچھا۔

’’جی بول رہی ہوں۔‘‘

’’سلمان صاحب تشریف رکھتے ہیں؟‘‘ پوچھا گیا۔

’’جی وہ تو کورٹ جاچکے ہیں۔‘‘ غزالہ نے کہا۔

’’خیر کوئی بات نہیں‘ مجھے آپ ہی سے بات کرنا تھی‘ وہ ایسا ہے کہ آپ

کا ایک خط ہے میرے پاس' وہ فوری طور پر آپ کو بھجوانا چاہتا ہوں۔ مجھے قیوم نے دیا تھا کل' آپ جانتی ہیں نا اسے آج صبح چار بجے اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ ہارٹ فیل ہو گیا تھا بیچارے کا۔ ایسا کرتا ہوں کہ اپنے ملازم کو دیتا ہوں' یہ خط وہ پندرہ منٹ کے بعد ہوم اکنامکس کالج کے پاس کھڑا ہو جائے گا۔ آپ جا کر اس سے یہ لفافہ لے لیں۔ کالا سیاہ ہے میرا ملازم' اوپر سے سونے پر سہاگہ سرخ رنگ کی جیکٹ پہنے ہوئے ہے' آپ فوراً پہچان جائیں گی۔

تو آپ پہنچ سکتی ہیں نا پندرہ منٹ میں وہاں' آپ کے گھر کے قریب ہی تو ہے یہ کالج۔"

"میں ضرور پہنچ جاؤں گی' مگر آپ کون بول رہے ہیں۔" غزالہ نے بے تابی سے پوچھا۔

میرا نام نعیم ہے' بیوی میری ڈاکٹر ہے۔ نسرین نام ہے اس کا۔ پچھلے ماہ اس نے قیوم کو کوارٹر میں رکھا تھا' ایسے ہی ترس کھا کر اس کا علاج کر رہی تھی اس کا' بچنا تو اس نے کیا تھا' دونوں پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے تھے' اوپر سے یرقان ہو گیا' کل شام بیچارے کی حالت بہت خراب ہوئی تو اس نے مجھے آپ کا فون نمبر دیا اور کہا کہ میرے اوورکوٹ کی جیب میں ایک لفافہ ہے وہ مسز سلمان کو دے دیجیے گا۔ میں اب نہیں بچوں گا۔ کہہ رہا تھا آپ نے اس کی ایک دفعہ بڑی مدد کی تھی۔ میرا خیال ہے مسز سلمان اس نے آپ کو شکریے کا خط لکھا ہے۔ اب سچی بات یہ ہے بیگم صاحبہ' کہ میں بہت وہمی انسان ہوں۔ چھوت چھات بہت کرتا ہوں۔ یرقان تو یوں بھی اڑ کر لگ جاتا ہے۔ سو میں نے نہ تو اس کے اوورکوٹ کو ہاتھ لگایا اور نہ اس لفافے کو' میرے ملازم نے سنبھال لیا ہے وہ خط' میں نے آج صبح اس کے کپڑے' بستر' اس کے صندوق کی ساری چیزیں نکلوا کر اپنے سامنے جلوائی ہیں۔ اپنے ملازم سے کہا کہ ایک ایک چیز کو آگ لگاؤ اور کمرہ

اچھی طرح سے ڈس انفکٹ کرو۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔" آخری جملہ بہت نرمی سے ادا کیا گیا۔

"جی میں بالکل سمجھ رہی ہوں۔" غزالہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا جو ان تین دنوں میں پہلی مرتبہ آج اس کی آنکھوں میں آئے تھے۔

"تو بی بی پہنچیے پھر ہوم اکنامکس کالج' میں ملازم کو دوڑاتا ہوں۔"

"میں ابھی پہنچ جاتی ہوں مگر اتنا تو بتا دیجیے۔ آپ لوگ کہاں رہتے ہیں' میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ غزالہ نے رندھی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو میرا فرض تھا اور ایک مرنے والے کی وصیت' بس آپ اپنا خط......"

ویسے بھی ہم لوگ آج شام کی فلائٹ سے کراچی جا رہے ہیں وہاں سے یورپ چلے جائیں گے۔ اب تو قیوم کی طرح ہم بھی آپ کو اگلے جہان ہی میں ملیں گے۔" ذرا مزاحیہ مگر نہایت شائستہ انداز میں کہا گیا۔

"مگر مجھے آپ کا پتہ ضرور چاہیے۔" غزالہ نے اپنے لہجے کو مضبوط بناتے ہوئے کہا۔

26 نمبر گھر میں رہتے ہیں ہم لوگ' آپ ہی کے بلاک میں' تھوڑی دیر بعد جواب آیا اور فون رکھ دیا گیا۔

سرخ جیکٹ والا ایک سیاہ فام لڑکا کالج گیٹ کے عین سامنے کھڑا تھا۔

"وہ لفافہ مجھے دے دو۔" غزالہ نے اس کے بالکل قریب جا کر کہا۔

"آپ کون؟" لڑکے نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

"میں مسز سلمان ہوں' ابھی ابھی نعیم صاحب سے میری فون پر بات ہوئی ہے۔"

لڑکے نے جیکٹ کی جیب سے سالن کے داغوں والا غلیظ لفافہ نکال کر اُسے تھمایا اور فوراً واپس مڑ گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر غزالہ نے لفافے میں سے تصویر نکالی اور ڈیش بورڈ پر پڑی ہوئی ماچس اٹھا کر ایک تیلی جلائی۔ تصویر کی گرم گرم راکھ اس کے پاؤں پر گری۔

سیدھا گھر جانے کے بجائے بے ارادہ ہی 26 نمبر کوٹھی تلاش کرنا شروع کی۔ جو فوراً مل گئی۔ دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا' ایک کھچڑی بالوں والی بوڑھی ملازمہ نے دروازہ کھولا۔

''نعیم صاحب اور ڈاکٹر نسرین یہاں رہتے ہیں؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''یہاں تو کوئی نعیم صاحب نہیں رہتے' نہ کوئی ڈاکٹر رہتی ہے۔ یہ تو رازی صاحب کا مکان ہے۔ انگلینڈ میں کام کرتے ہیں۔'' ملازمہ واپس جانے کے لیے مڑی۔

''ایک منٹ رکو۔'' غزالہ نے کہا۔

ملازمہ رک گئی۔

''اس کوٹھی کے کوارٹر میں آج صبح کسی کی موت ہوئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ......

''توبہ توبہ کریں جی' کوارٹر میں تو میں اور میرے بچے رہتے ہیں اللہ انہیں لمبی حیاتی دے۔'' ملازمہ نے ذرا غصے سے جواب دیا اور زور سے دروازہ بند کرتی ہوئی واپس چلی گئی۔

''وہ سرخ جیکٹ والا لڑکا بھی ایک منٹ میں غائب ہو گیا' بھتنا' خیر دیکھو شاید کبھی نظر آ جائے تو' اس سے پوچھوں گی۔''

غزالہ نے گاڑی گھر کی جانب موڑتے ہوئے سوچا۔

ناپاک

''دیکھو امی' جانان نے پھر وہی حرکت کی ہے' سارا کوڑا ڈرم سے باہر پھینک دیا ہے اور اب واپس نہیں ڈالتا۔'' میں اپنے گیٹ کے پاس پہنچی تو میرے بیٹے نے شکایت کی۔

مجھے دیکھ کر جانان سیدھا کھڑا ہو گیا۔ ''ڈالے گا' ڈالے گا' انشاء اللہ خامخواہ ڈالے گا۔'' غصہ مت کرو' وہ بہت پُریقین لہجے میں بولا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے صبر کرنے کو کہا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کوڑے میں لتھڑے ہوئے تھے اور سردی کی شدت سے پھٹی ہوئی جلد سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ میں اس معمول کے جھگڑے کو نپٹائے بغیر پنسلین کی مرہم لینے اندر چلی گئی کیونکہ تقریباً روزانہ میرے بیٹے کی اُس سے اسی بات پر تکرار ہوا کرتی تھی۔

جانان نو دس برس کا افغانی بچہ تھا۔ گول مٹول سرخ و سفید۔ وہ بہت صبح صبح ہماری گلی میں آ جایا کرتا تھا اور اس سے پہلے کہ سی۔ڈی۔اے کی گاڑی آ کر کوٹھیوں میں رکھے ہوئے کوڑے کے ڈرم اور بڑے بڑے پلاسٹک کے تھیلے خالی کر کے جائے وہ ان میں سے کار آمد اشیاء نکال لیتا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کی کمر پر لٹکی ہوئی بوری گھی کے خالی کنستروں' خالی بوتلوں اور بڑی بڑی

ہڈیوں سے بھر جاتی تھی۔ اس کام میں تیزی دکھانا اس کی مجبوری تھی اس لیے وہ اکثر تھوڑا بہت کوڑا باہر پھینک کر دوسری کوٹھی میں گھس جاتا تھا اور یوں سب لوگوں سے ڈانٹ کھایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی ماں بھی ہمراہ ہوتی جو کوٹھیوں کے لان میں اُگی ہوئی زائد گھاس کاٹ کر جمع کیا کرتی تھی۔ وہ پچیس چھبیس برس کی ایک لمبے قد کی عورت تھی۔ اس نے سر اور چہرے پر ایک کالے رنگ کا ڈھاٹا سا باندھا ہوتا جس میں سے صرف اس کی آنکھیں نظر آتیں' ان نظر آنے والی آنکھوں پر لال اور کالی روشنائی لگی ہوتی اور اس سارے گیٹ اپ میں وہ ایک ڈاکو اور بھتنی کا امتزاج معلوم ہوتی۔ مگر مجھے ایک دو مرتبہ اس کی اصل شکل دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا' جب وہ اور جانان میرے باورچی خانے میں پانی پینے کے لیے آئے۔ تب معلوم ہوا کہ ڈھاٹے نے ایک خوبصورت اور جوان چہرے کو کیموفلاج کر کے پناہ دے رکھی ہے۔ انہیں دو چار ملاقاتوں میں مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ جانان کا باپ افغانستان کے جہاد میں مارا جا چکا تھا اور اس کی موت کے بعد دونوں ماں بیٹا ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ اسلام آباد میں کسی ہمدرد آدمی نے انہیں اپنے زیرِ تعمیر مکان کی سیمنٹ وغیرہ رکھنے والی کچی کوٹھڑی میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ مگر جانان کی ماں فکرمند رہتی تھی کہ مکان مکمل ہونے کے بعد انہیں وہاں سے نکلنا پڑے گا۔ جانان جب اپنی ماں کو روتے دیکھتا تو مجھے کہتا۔

''بیگم صاحب ماں کو بولو فکر نہ کرے' ادھر اسلام آباد میں اللہ کا اتنا بڑا جنگل ہے' ہم اس میں چھپر ڈالے گا۔''

وہ سی-ڈی-اے کے بنائے ہوئے گرین ایریا کو اللہ کا جنگل سمجھتا تھا اور اس کے خیال میں وہاں گھر بنانے کی مکمل آزادی تھی۔ مجھے اس کی معصومیت پر ترس آتا مگر جس جوانمردی سے وہ اپنی ماں کو تسلی دیتا تھا اسے دیکھ کر میری ہمت

نہیں پڑتی تھی کہ میں اسے زندگی کی ایک اور تلخ حقیقت سے آگاہ کروں۔

جانان پانچ چھ روز سے غائب تھا۔ جس روز دوبارہ آیا تو اس کی ٹانگ پر ایک میلی سی پٹی بندھی ہوئی تھی جس پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔

''پیلی کوٹھی لوگ کا کتا کاٹ گیا۔'' اس نے مجھے اطلاع دی۔

''کتوں والے گھر میں نہ جایا کرو۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ابھی کیا کرے گا' جانا پڑے گا۔ روزی کا بات ہے۔''

دونوں ماں بیٹا اپنی گفتگو میں ماضی' حال اور مستقبل کے صیغوں کو خوب گڈمڈ کیا کرتے تھے۔

''ادھر کیسا مسلمان لوگ ہے' حرام جانور پالتا ہے۔ بیگم صاحب تم کتا مت رکھنا' نجس جانور ہے۔'' اس نے پٹی بدلواتے ہوئے مجھے نصیحت کی۔ ''اچھا بیگم صاحب' آج آٹھ نمبر میں بکرا قربانی کیا' اتنا بچہ جمع ہو گیا گوشت کا واسطے۔''

وہ آج باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

''تم کیوں نہیں گئے' تمہیں گوشت کھانا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے پوچھا۔

''اچھا لگتا ہے' اس نے ذرا جھینپ کر کہا' مگر ادھر چوکیدار سے ہمارا لڑائی ہے کیسے جائے گا۔''

''لڑائی کیوں ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ ہمیں کوٹھی میں جانے کو چھوڑتا نہیں' بولتا ہے تم سب چور ہے' ہم بولتا ہے ہم روٹی چیز بیتا ہے' چوری کیسے کرے گا' ابھی ہم بڑا ہو کر بندوق لائے گا اور چوکیدار کو ایک دم فارغ کر دے گا۔'' وہ جلال میں آ گیا۔

''تمہاری ماں کدھر ہے آج۔'' میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے بات بدلی۔

''پانچ نمبر میں گیا' ادھر کوٹھی بنتا ہے' تہ خانے میں اتنا بڑا بڑا گھاس ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ سر سے بلند کر کے خوشی سے اعلان کیا۔

اچانک باہر گلی میں شور سنائی دیا اور لوگوں کے بھاگنے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں' ان میں جانان کی ماں کے چیخنے چلانے اور پشتو میں گالیاں دینے کی آواز سب سے اونچی تھی۔ میں بھاگ کر گلی میں پہنچی۔ دو تین پولیس والوں نے جانان کی ماں کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور ان کے پیچھے ایک ہجوم اُمڈا چلا آ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے ایک پولیس والے سے پوچھا۔

''اس نے پانچ نمبر کوٹھی کے چوکیدار کو مار دیا ہے۔'' پولیس والے نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گھاس کاٹنے والی درانتی مجھے دکھاتے ہوئے کہا جس پر خون جما ہوا تھا۔

''کیوں مارا ہے؟'' میں نے حواس باختہ ہو کر سوال کیا۔

''جناب یہ گھاس کاٹنے بیسمنٹ (Basement) میں اُتری تھی' وہاں چوکیدار نے اسے منع کیا' بہت جھگڑا ہو گیا' بس اس نے اس کے گلے پر درانتی مار دی۔ جناب یہ لوگ چوریاں کرتے ہیں' اسی لیے چوکیدار نے اسے روکا تھا۔''

پولیس والے نے بہت حتمی انداز میں بات کی۔

''وہ مکان تو ابھی بن رہا ہے' وہاں کیا چوری ہو گی'' میں نے ذرا غصے سے کہا۔ ''یہ لوگ تو اینٹیں بھی چرا لیتے ہیں۔'' پولیس والے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''ایسا نہیں ہوا بیگم صاحب۔'' جانان کی ماں ہذیانی آواز میں چیخی۔

''وہ۔ مردود' خبیث' دلا' دیوس ہم کو پکڑا' ہم بولا ہم عزت والا عورت ہے ہم کو جانے دو' پر وہ نہیں چھوڑتا تھا' پھر ہم کیا کرتا۔''

آج اس کا ڈھاٹا کھلا ہوا تھا اور آنکھوں پر لگی ہوئی روشنائی پسینے اور آنسوؤں کے ساتھ اس کے پورے چہرے پر پھیل گئی تھی۔

''تم بالکل سچ بول رہی ہو مجھے اچھی طرح سے پتہ ہے۔'' میں نے اپنے آنسو پیتے ہوئے جانان کی ماں کا ہاتھ پکڑا۔ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لیے بہت غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا ''تم فکر نہ کرو بیگم صاحب' ہم پاک ہے۔ اللہ کی قسم ہم پاک ہے انشاء اللہ۔''

پھر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سمجھایا کہ چوکیدار اپنے برے ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے خیال میں میں اس کے ناپاک ہو جانے پر رو رہی تھی۔

''ضمانت تو آسانی سے ہو گئی ہو گی۔ یہ تو سیلف ڈیفنس (Self-Defence) کا کیس تھا نا۔'' میں نے اپنے شوہر سے پوچھا جو پولیس اسٹیشن اور عدالت کا چکر لگا کر ابھی واپس آئے تھے۔

''جانان کی ماں ہاسپٹل میں ہے' بہت زخمی ہے۔'' انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیوں کیا ہوا۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کل رات کچھ پولیس والوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ اس نے غصے میں آ کر ٹوٹا ہوا شیشہ اپنے پیٹ میں مار لیا۔ بہت گہرا زخم آیا ہے۔''

میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

''معطل ہو گئے ہیں سب' انکوائری کے آرڈرز بھی ہو گئے ہیں۔'' انہوں نے مجھے تسلی دی۔

سودا

پچھلے ایک ہفتے سے نہ تو وہ آیا نظر آ رہی تھی اور نہ ہی وہ خوبصورت گول گتھنے بچے۔ ''لگتا ہے لاہور چلی گئی ہے۔ اپنے بھائی بھابی کے پاس۔'' میں نے سوچا۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میرا صبح شام آدھ گھنٹہ واک کرنا ضروری تھا۔ اس زبردستی والی واک کے لیے دل بہت کڑا کرنا پڑتا تھا۔ بہت کوفت ہوتی لیکن جب گلی کے آخری سرے پر ان دونوں بچوں کو دیکھتی جنہیں ان کی آیا گہرے نیلے رنگ کی شاندار پریم میں آہستہ آہستہ لے کر آ رہی ہوتی تو طبیعت شگفتہ ہو جاتی۔ بچے جڑواں تھے اور ہم شکل بھی۔ ایک لڑکا ایک لڑکی' زیتونی رنگت کے چہرے' براؤن بال اور کالی بھوری سی آنکھیں۔ اکثر انہوں نے ایک جیسے امپورٹڈ کاٹن کے ہلکے رنگوں کے فراک پہنے ہوتے جن کے گلے اور بازوؤں پر خوبصورت رنگوں کی لیس لگی ہوتی۔ میں انہیں دیکھ کر ہمیشہ رک جاتی۔ ان کی آیا بھی بہت مسکرا کر میرا استقبال کرتی۔ غالباً سال سوا سال کے ہوں گے مگر اب وہ مجھے پہچاننے لگے تھے اس لیے مجھے دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا کرتے۔ آیا نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ وہ ایف سیون تھری کے سیکٹر سے

یہاں اتنی دور اس لیے آتی ہے کہ وہاں بچوں کے لیے کچھ کوئی اچھا پارک نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ بچے کسی میم صاحب کے ہیں جو تین چار برس پہلے سکاٹ لینڈ سے یہاں پاکستان میں شفٹ ہوئی ہیں۔ ''مگر وہ دو ماہ پہلے ان کے ہاں ملازم ہوئی ہے۔''

بے حد اجلی رنگت لیکن معمولی سے نقش و نگار والی آیا ہمیشہ بہت صاف ستھری لگا کرتی۔ اس کے لباس اور جوتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بہت خوشحال گھرانے میں ملازم ہے۔ وہ خود بھی پیٹ سے تھی' غالباً چھٹا ساتواں مہینہ تھا اسے۔ چنانچہ پارک میں پہنچتے ہی وہ فوراً ایک بینچ پر بیٹھ جاتی۔ کبھی کبھی میں بھی سانس لینے کے لیے اس کے پاس جا بیٹھتی۔

''اگلے مہینے میں لاہور چلی جاؤں گی۔'' ایک دن اس نے اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔ وہاں میرے بھائی اور بھابی رہتے ہیں۔ یہ بچہ ادھر ہی پیدا ہوگا۔''

''تمہارا خاوند کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ دبئی میں ہے بیگم صاحب میں نے تو اس کے لیے اپنا مذہب بھی تبدیل کر لیا' نسرین بیگم نام رکھا۔'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''مسلم ہو گئی لیکن اس کو میری زیادہ پروا نہیں ہے۔ سال چھ مہینے کے بعد آتا ہے۔ خیر آج کل تو میرا سارا خرچہ میم صاحب اٹھاتی ہے۔ بہت نیک عورت ہے۔'' آیا نے نہایت فخر سے بتایا۔

''تو جب تمہارا بچہ ہوگا تو تم کیسے کام کرو گی۔ یہ ڈیوٹی تو بہت سخت ہوتی ہے۔''

''کوئی فکر نہیں۔'' وہ بولی ''میم صاحب نے کہا ہے تمہارا بچہ میرے بچوں کی طرح پلے گا' میں نے بتایا ہے نا آپ کو وہ بڑی اچھی عورت ہے۔ اگر کوئی

ادھر کی ہوتی.....''اس نے میری طرف دیکھ کر فوراً زبان روکی'' وہ تو مجھ کو ہسپتال کا خرچہ بھی دے رہی ہے بچے کی پیدائش کا۔''

تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ میں بھی اسے اور ان پیارے پیارے بچوں کو بھول بھال گئی۔ ایک دن اچانک وہ مجھے آبپارہ مارکیٹ میں کپڑوں کی ایک دکان پر خریداری کرتی ہوئی مل گئی۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والی سلک کی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں سونے کے ٹاپس تھے۔ بالوں کو جوڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔ اس کی صحت بھی بہتر ہوگئی تھی اور رنگت پہلے سے بھی زیادہ اُجلی۔

''ارے نسرین تم کہاں۔'' میں نے محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ کوئی بہت قیمتی خوشبو لگائے ہوئے تھی۔

''تم کب آئیں لاہور سے۔'' میں نے پوچھا ''یہاں تو کافی عرصے سے نظر نہیں آئیں۔''

''بیگم صاحب دراصل میری اپنے میاں کے ساتھ صلح ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے دبئی بلا لیا۔ وہاں ایک سال رہی۔ پیسے ویسے بھی کافی دیتا رہا۔ اچھا گزارہ ہو رہا تھا لیکن دیکھئے جی وہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دیتا تھا۔ وہ میر پور کے کسی گاؤں میں رہتی ہے۔ ہر تین مہینے کے بعد اس کو ملنے پاکستان جاتا تھا۔ پتہ نہیں کمپنی والے چھٹی کیسے دے دیتے تھے۔ بس اس بیوی والی بات پر میری بڑی لڑائی ہوتی تھی۔'' وہ چپ ہوگئی۔

''پھر کیا ہوا۔'' میں نے پوچھا۔

''پھر میں اسے چھوڑ کر آگئی۔ میں دو بیویوں والی بات کو گناہ سمجھتی

ہوں۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

''اور تمہارا بچہ؟''

''ہائے افسوس بیگم صاحب وہ تو مر گیا۔ اس کو گردن توڑ بخار ہوگیا تھا۔ سات ماہ کا تھا۔''

''ہائے ہائے واقعی بڑا افسوس ہوا۔'' میں نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔ ''تو اب کیا کر رہی ہو کہاں رہتی ہو۔''

''اب ایک امریکی جوڑے کے پاس ملازم ہوں وہ ادھر سفارت خانے میں ہوتے ہیں۔ انہی کے ساتھ رہتی ہوں۔ ابھی دیکھیں میم صاحب نے مجھے سارے نوکروں کے لیے کپڑے خریدنے بھیجا ہے۔ کرسمس آ رہا ہے نا۔ سارے نوکروں کو نئے کپڑے دے گی میم صاحب۔ وہ دیکھیں باہر گاڑی میں صاحب بھی بیٹھا ہے۔ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر۔ صاحب کی گود میں جو بچہ ہے اب میں اس کی آیا ہوں۔''

میں نے دکان سے باہر جھانکا جہاں ایک لمبی سی سیاہ رنگ کی پیلے نمبر پلیٹ والی گاڑی میں کوئی امریکی بیٹھا تھا۔ اس کی گود میں واقعی چھوٹا سا بچہ تھا۔ میں نے انہیں دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا۔ امریکی نے گاڑی کا شیشہ اتارا اور بچے کا سر باہر نکال کر مجھے وش کرنے کے لیے کہا۔ بچے نے ہاتھ ہلایا۔ یہ بھی ایک انتہائی پیارا بچہ تھا۔ براؤن آنکھوں والا سرخ و سفید۔ بال سیاہ کالے تھے جس سے وہ اور بھی گورا لگ رہا تھا۔

آیا نے مجھ سے میرا فون نمبر لیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

میری دوست صبحت بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ میں اس کے ساتھ ڈپلومیٹک انکلیو میں وہ فلیٹ چل کر دیکھوں جسے وہ خریدنا چاہتی تھی۔

"بڑا کرایہ ملتا ہے۔ ان فلیٹس کا' اور وہ بھی ڈالر میں شبنم۔"

"وہ کیسے۔" میں نے پوچھا۔

"ایسا ہے کہ زیادہ تر فارنرز ان فلیٹوں کو کرایے پر لیتے ہیں۔ خریدے تو سب پاکستانیوں نے ہیں مگر جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ ہزاروں ڈالر تک کرایہ مل سکتا ہے تو ظاہر ہے پھر خود وہاں شفٹ ہونے میں نقصان ہی نظر آتا ہے نا۔"

اتفاق سے میں اتوار کو بالکل فارغ تھی۔ میں نے اسے فون کیا آج لے چلو مجھے فلیٹ دکھانے۔ وہ فوراً ہی آ گئی اور ہم چل پڑے۔

امریکن ایمبیسی سے آگے اس نے گاڑی قائداعظم یونیورسٹی والی نکھری ہوئی کشادہ سڑک کی طرف موڑی۔ ایک جگہ پر جہاں بیریئر لگا تھا دربان نے ہمیں روکا۔ صباحت نے اسے پاس دکھایا اور ہم دونوں ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے۔

"بھئی کیا شاندار جگہ ہے۔" میں نے سڑک کے دونوں جانب ایستادہ امریکن سٹائل کے اپارٹمنٹس کو دیکھ کر نعرہ لگایا۔ ہر بلڈنگ کے سامنے صاف ستھری تراشیدہ گھاس کے قطعے تھے جن میں سفید بینچ رکھے ہوئے تھے۔ فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ میں مسحور سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ابھی ذرا اندر تو چلو" میری سہیلی نے فخریہ انداز سے کہا۔

"واقعی یہ تو جنتِ ارضی ہے۔" میں نے گراؤنڈ فلور کے اس فلیٹ میں پہنچ کر کہا صباحت جیسے خریدنے کے موڈ میں تھی۔

"او پر والے فلیٹس نہیں دیکھو گی؟"

"نہیں بھئی دل کی مریض ہوں مجھے سیڑھیاں چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تم جاؤ میں یہیں سامنے والے لان میں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گی۔"

سامنے لان میں آٹھ دس بچے کھیل رہے تھے جن میں اکثریت فارنرز

کے بچوں کی تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر بچوں سے باتیں شروع کر دیں۔ لان کے آخری سرے پر ایک آیا ٹائپ عورت سٹرولر میں بیٹھے ہوئے بچے کو کچھ کھلا رہی تھی۔ میری آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا سٹرولر دھکیلتی ہوئی آئی اور میرے قریب پہنچ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس بچے کو فوراً پہچان لیا۔ غالباً اس کے سیاہ بالوں کی وجہ سے۔ یہ وہی بچہ تھا جو تین چار ماہ پہلے آبپارہ کی مارکیٹ میں نسرین بیگم اور ایک امریکی کے ساتھ تھا۔

میں نے اس آیا سے اِدھر اُدھر کی بات چیت کے بعد پوچھا۔

"اس بچے کی پہلی والی آیا کیا نوکری چھوڑ گئی۔ نسرین نام تھا شاید اس کا؟"

"ہاں چھوڑ گئی۔" آیا نے جلدی سے جواب دیا اور لاتعلقی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"کہاں ہوتی ہے اب وہ۔"

"وہ سکاٹ لینڈ گئی ہے اُدھر ایک میم صاحب اسے لے گئی ہے۔" آیا نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں ہاں میں اسے جانتی ہوں۔ وہی نا۔ جس کے ہاں وہ پہلے ملازم تھی۔ اس میم کے دو بچے بھی تھے نا۔ بڑے پیارے پیارے۔"

"جی وہی۔" آیا نے مختصر ترین جواب دے کر منہ موڑ لیا۔

"لگتا ہے بڑی پسند تھی اس میم کو نسرین۔ دیکھو نا اسے ساتھ لے کر چلی گئی۔ ویسے وہ تھی بھی بہت سمارٹ' بڑی اچھی انگریزی بولتی تھی۔ کپڑے بھی ٹھیک ٹھاک پہنا کرتی تھی۔" میں نے آیا سے کچھ اگلوانے کے لیے پروفیشنل جیلسی والا حربہ آزمایا جو کارگر ثابت ہوا۔

"جی کچھ زیادہ ہی سمارٹ تھی وہ۔" آیا نے طنزیہ لہجے میں کہا اور

پھر منہ پھیر لیا۔

''اچھا سنو۔ تم بھی اپنے لیے ایک اچھا سا سوٹ بنوالو۔'' میں نے پرس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس مرتبہ میں نے صدیوں سے آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔

''اس کا خاوند کہاں ہے۔ دوبئی میں ہوتا تھا نا۔'' میں نے پوچھا۔

''جی وہ ہمیشہ دوبئی میں ہوتا ہے۔'' اس دفعہ جواب دیتے ہوئے وہ اپنی ہنسی نہ روک سکی۔

''کیا بات ہے تم کچھ چھپا رہی ہو۔'' (میرے ذہن میں بننے والی کہانی اب اپنے کلائمکس کو پہنچنے والی تھی۔)

''میں بتاتی ہوں آپ کو لیکن دیکھیں باجی خدا کے لیے اِدھر اُدھر بات نہ کریں۔ ورنہ میری نوکری خلاص۔''

''تم بالکل بے فکر رہو۔ میری تو شکل بھی اب تمہیں یہاں کبھی نظر نہیں آئے گی۔ دراصل مجھے اس عورت کی حرکتیں کچھ عجیب سی لگتی تھیں اس لیے پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''باجی تینوں بچے نسرین کے اپنے ہیں۔'' اس نے تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا۔ ''یہ والا بھی۔ اس نے سٹرولر میں بیٹھے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ اور وہ دونوں بھی جو میم صاحب کے بتاتی تھی۔'' آخری دو جملے اس نے انتہائی رازدارانہ لہجے میں اور بہت آہستگی کے ساتھ ادا کیے۔

''ہیں کیا واقعی۔'' میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ والا تو کسی ایرانی کا ہے۔ کہتی تھی'' اس نے متعہ کیا تھا میرے ساتھ۔''

''اور وہ دوسرے دونوں۔''

''وہ بھی کسی گورے کے تھے۔ اب وہ اپنے ملک واپس چلا گیا ہے۔''

''مگر یہ سارا چکر۔'' مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''باجی نسرین اپنے بچے بیچتی ہے۔ اسی لیے تو بہت دیکھ بھال کر مرد کو پسند کرتی ہے دیکھیں نا کالے بچوں کو کون خریدے گا۔ بڑی کمائی ہے اس میں۔'' آیا نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''مگر اپنی اولاد بیچنا اور پھر اس طریقے سے بچے پیدا کرنا۔'' میں باوجود اپنی تمام تر روشن خیالی کے اخلاقیات کی مار دینے پر اُتر آئی۔

''ارے باجی چھوڑیں۔ غریب آدمی اونٹوں والوں کو بھی تو اپنے بچے دے دیتے ہیں۔ ریس میں لگانے کے لیے۔ سوچیں وہاں کتنی تکلیف ہوتی ہے ان چھوٹی چھوٹی جانوں کو۔ کئی ٹانگیں تڑوا کر واپس آتے ہیں۔ بعضے بعضے تو مر بھی جاتے ہیں۔ اس کے بچے تو عیش کرتے ہیں۔ بے اولاد میموں کے آگے بیچتی ہے۔ دیسیوں کو منہ نہیں لگاتی۔ پوری طرح لکھائی پڑھائی ہوتی ہے۔ بڑی شرطیں لکھواتی ہے۔''

''مگر اس کا خاوند۔''

''او باجی اس کا کوئی خاوند نہیں ہے ایسے ہی دل سے قصے گھڑ گھڑ کے لوگوں کو سناتی رہتی ہے۔ نا کوئی دین نا کوئی ایمان۔ نا کوئی مذہب...... پتہ نہیں مسلمان ہے ہندو کہ عیسائی......'' کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آیا نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ مگر پھر بھی دیکھ لیں باجی۔ کتنے بھاگ لگائے ہیں قسمت نے اس کو۔ آپ کو پتہ ہے وہ سکاٹ لینڈ والی میم جو ہے نا' اس نے ٹکٹ بھیج کر اسے بلایا ہے کہ آ کر اپنے بچوں کو دیکھ لو۔ اس نے میم کو یہاں سے فون کیا تھا'' میرا دل بڑا اداس ہے بچوں کے لیے' ہر وقت روتی رہتی ہوں ان کی یاد میں۔''

لیکن نہیں خواہاں کوئی

کالج سے واپس پہنچی تو اپنی ساس کو خلاف معمول بے حد ہشاش بشاش پایا۔ انہوں نے میرے ہاتھوں سے راستے میں کی ہوئی خریداری کے تھیلے جلدی سے پکڑے اور چہکتے ہوئے بولیں "اے بیوی آج اتنی دیر کر دی۔ تمہاری ایک سہیلی تو یہاں گھنٹہ بھر تمہارے انتظار میں سوکھتی رہی۔ ابھی ابھی گئی ہیں۔ تم پانچ منٹ پہلے آ جاتی تو ملاقات ہو جاتی اس بیچاری سے۔"

میں اپنی کسی سہیلی کے لیے ان کے اتنے ہمدردانہ جذبات دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی کیونکہ عموماً وہ میری ملنے والیوں کو بہت ناپسند کرتی ہیں ان کے خیال میں میری ہر ملنے والی نبات نک چڑھی، منہ پھٹ، شرم و حیا سے عاری اور فیشن کی ماری ہوتی ہے۔ کون تھیں؟ کیا نام بتایا تھا؟ مجھے تجسس ہوا۔

"اے لو نام تو بھول ہی گئی۔" وہ ذرا متاسف نظر آئیں خیر ابھی یاد آ جائے گا' انہوں نے مجھے اطمینان دلایا۔

"کیسی تھیں؟ میرا مطلب ہے شکل و صورت۔" "بیحد حسین و جمیل۔" انہوں نے میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے جواب دیا۔ "گوری چٹی' لمبی اونچی' یہ بڑی بڑی آنکھیں' کسی بہت اونچے شریف خاندان کی معلوم ہوتی تھیں یہاں گھر

میں بھی تمام وقت برقعہ اوڑھے رہیں۔ تم نے جو ایک جوان مسٹنڈا ملازم گھر میں رکھ چھوڑا ہے برقعہ کیسے اتارتی! میری ساس نے فیصلہ صادر کیا۔ "آپ نے ان کی کچھ خاطر واطر بھی کی۔" میں نے یونہی گفتگو جاری رکھنے کے لیے کہا۔ "کیسے نہیں کی۔ تم نے مجھے ایسا ہی سمجھ رکھا ہے وہ ذرا ناراضگی سے بولیں۔" میں تو تب باورچی خانے میں تھی اپنے لیے مونگ کی کھچڑی پکا رہی تھی' انہیں میں نے گول کمرے میں بٹھایا۔ سوچا ذرا بگھار دے لوں تو بیٹھتی ہوں ان کے پاس جا کر پہنچی خاص تھی کے بگھار کی خوشبو تو گول کمرے تک گئی خود ہی اٹھ کر میرے پاس باورچی خانے میں چلی آئیں۔ بولیں خالہ جان کیا پکا رہی ہیں میں نے جھٹ ایک صاف سینی لی اس میں چینی کی رکابی رکھی اور کھچڑی پروس دی ساتھ میں چمچہ بھی رکھ دیا۔ میں تمام نئے طور طریقوں سے بھی واقف ہوں۔

میری ساس نے فخریہ کہا' بہت رغبت سے کھائی انہوں نے وہیں میرے پاس بیٹھ کر اے لو مجھے نام بھی یاد آ گیا' ان کا..... نازی نام بتلایا تھا انہوں نے اپنا' بتا رہی تھیں شوہر فوج میں کرنیل ہیں افسوس کر رہی تھیں آٹھ سال ہو گئے شادی کو بچہ نہیں ہوا۔ میں نے ایک وظیفہ بتا دیا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔ بولیں لکھ کر دے دیجیے گا' میں یاد کر لوں گی۔ میری ساس اور جانے کیا کچھ کہتی رہیں مگر نازی کا نام سننے کے بعد میری دلچسپی اس قصے سے ختم ہو گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھی تو انہوں نے کہا۔ "انہیں فون کر لینا بہت تاکید کر گئی ہیں۔" نازی میرے شوہر کے ایک بہت قریبی دوست کرنل بخاری کی رکھیل تھی۔ کرنل صاحب فوج سے ریٹائرمنٹ لے چکے تھے اور اب انہوں نے جائیداد کی خرید و فروخت کی ایک ایجنسی کھول لی تھی۔ نازی کو انہوں نے گلبرگ میں ایک کوٹھی لے کر دے رکھی تھی اور خود بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ شادی شدہ تھے اور اب دوسرے نکاح کی عدت نہیں پالنا چاہتے تھے۔ نازی بھی

کبھی ان سے اسی بات پر ناراض بھی ہو جاتی تھی۔ وہ ماضی میں پاکستان فلم انڈسٹری کی ایک ناکام ہیروئن رہ چکی تھی اور کسی فرضی نام سے فلموں میں چھوٹے موٹے رول بھی کرتی تھی وہ ماں کی طرف سے ایرانی نژاد تھی اور اس کا باپ بنوں کا پٹھان تھا۔ گورا چٹا رنگ اسے اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا۔

اس کے قد بت اور شکل وصورت کو دیکھتے ہوئے مجھے فلموں میں اس کی ناکامی کی اور کوئی وجہ تو سمجھ نہیں آتی تھی سوائے اس کے کہ جسم کے تمام نسوانی پیچ وخم کے متناسب ہونے کے باوجود اس میں مردانہ پن کی ایک جھلک تھی مگر ایسا میں ہی سوچتی تھی۔ فلموں کے ناظرین کے مطابق وہ فوٹو جینک نہیں تھی اور یہی اس کی بدقسمتی تھی۔ بہرحال فلموں میں پے درپے ناکامیوں اور کرنل بخاری کو اپنے اوپر فریفتہ کر لینے کے بعد اس نے اس قصے کو ختم کر دیا تھا اور اب اس کی خوب گزر رہی تھی۔ کرنل صاحب جب مذاق کے موڈ میں ہوتے تو اسے چھیڑتے..... ''نازی تم فلموں میں ناکام مگر زندگی میں بہت کامیاب ایکٹریس ہو۔''

اس نے اب لوگوں سے ملنا جلنا اور باہر نکلنا بہت کم کر دیا تھا۔ دن میں اگر اسے کہیں جانا پڑتا تو وہ برقعہ اوڑھتی تھی البتہ کبھی کبھی رات کو کرنل صاحب اسے اپنے بے تکلف دوستوں کے ہاں بغیر برقعے کے لے جاتے۔ ایسے موقعوں پر اس کی سج دھج دیکھنے کے قابل ہوتی۔ وہ عموماً شوخ رنگوں کے سکرٹ اور بلاؤزر میں ملبوس ہوتی اور اس کے سنہرے بال شانوں پر کھلے پڑے ہوتے اور جب وہ ایک خاص ادا سے سگریٹ جلاتی تو بالکل مار دھاڑ سے بھرپور امریکن فلموں کی ہیروئن معلوم ہوتی بلکہ بعض اوقات ہیرو لگتی۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگاتی اور ہر قہقہے کے ساتھ کرنل صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پوچھتی کیوں سر جی کیسی رہی..... ''بہت اعلیٰ''......وہ جواب دیتے کرنل بخاری خود بھی بہت وجیہہ آدمی تھے۔ نہایت خوش مزاج اور خوش مذاق' کھلے دل و دماغ سے بات کرنے

والے۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت ملنے والوں پر بہت خوشگوار تاثر چھوڑتی تھی۔

ادھر ادھر سے میں نے ان کی سہروں جلوؤں کے ساتھ بیاہی ہوئی بیوی کی بھی بہت تعریف سن رکھی تھی اور مجھے ان سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا مگر وہ انہیں ہمارے ہاں کبھی لے کر نہیں آئے تھے۔

ان سے میری ملاقات اچانک ہوئی۔ پانچ چھ ماہ پہلے کرنل صاحب ہمارے ہاں آئے تو انہوں نے کہا میری بچیاں آپ کے کالج میں داخلہ لینا چاہتی ہیں۔ کل وہ اپنی ماں کے ساتھ آپ سے ملنے آئیں گی وہاں۔ ذرا فارم وغیرہ بھرنے میں ان کی مدد کر دیجیے گا۔

دوسرے دن کالج پہنچی تو گیٹ سے داخل ہوتے ہی مجھے اپنی ایک شاعرہ کولیگ مل گئی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔

''آج ہمارا سٹاف روم حسن وجمال سے جگمگا رہا ہے، بہت روشن لگ رہا ہے۔''

میں نے پوچھا'' کیسے؟''

بولی...... ''آپ کی کچھ حسین ملنے والیاں وہاں بیٹھ کر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جایئے جلدی سے مل لیجیے۔''

کرنل صاحب کی بیگم اور ان کی بچیوں کو دیکھنے کے بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ شاعروں پر مبالغہ کرنے کا الزام خواہ مخواہ لگایا جاتا ہے تینوں ماں بیٹیاں میری شاعرہ کولیگ کے بیان سے کچھ زیادہ کی مستحق تھیں۔ بیگم بخاری آف وہائیٹ سلک کے سوٹ اور شیفون کے دوپٹے میں کسی پرانے مصور کی بنائی ہوئی ایک مغلئی شہزادی کی تصویر معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے ناک میں ہیرے کی کیل پہن رکھی تھی جوان کے کندنی رنگ کے ساتھ مل کر ایک سحر انگیز کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک مہذب قسم کی

تمکنت تھی۔ البتہ ان کے ہلکے براؤن رنگ کی خوبصورت آنکھوں سے کچھ ایسا
حزن وملال جھلکتا تھا کہ جس سے پوری شخصیت افسردگی میں ڈوبی ہوئی معلوم
ہوتی تھی۔ دونوں بچیوں بھی والدین کے مشترکہ ورثہ حسن کی مکمل مالک تھیں۔
میں کرنل صاحب کی بیگم کی نفیس' شائستہ اور سنجیدہ گفتگو سے بہت متاثر ہوئی اور
کہا چلئے گھر چل کر بیٹھتے ہیں وہیں آپ کا کام بھی ہو جائے گا اور چائے بھی
پئیں گے۔

''ان کے والد نے گاڑی بس دو گھنٹے کے لیے بھیجی ہے''......انہوں
نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''گاڑی واپس بھجوا دیں میں آپ کو ڈراپ کروا دوں گی۔'' میں نے
پیشکش کی۔ وہ تیار ہو گئیں۔ میں پورے راستے کے دوران یہی سوچتی رہی کہ
ایسی بیوی کی موجودگی میں بھی رکھیل کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے؟

''یہ نازی والا سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟'' میں نے ان کے لیے
چائے بناتے ہوئے پوچھا......

''تین چار برس سے''......انہوں نے آہستہ سے کہا۔

اور اس سے پہلے۔ میرا مطلب ہے اس قصے سے پہلے تو کرنل
صاحب ٹھیک ٹھاک تھے ناں؟......

''کوئی ایسے بھی نہیں۔'' ''دراصل میں انہیں شروع ہی سے پسند نہیں
آئی۔ بس رسمی سا تعلق رکھا انہوں نے میرے ساتھ......'' انہوں نے جیسے اپنے
آپ سے کہا......

''مگر آپ جیسی مکمل عورت کے بعد انہیں اور کیا چاہیے تھا؟''......میں
نے حیرانی سے سوال کیا......

''کرنل صاحب کو چٹاخ پٹاخ قسم کی عورتیں اچھی لگتی ہیں اور مجھے تو

آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔'' ایک افسردہ سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر آئی......

''بچے کوئی بات نہیں کرتے باپ سے اس معاملے میں''......میں نے
پوچھا......

''میرا بیٹا تو ناراض ہو کر پاکستان ہی چھوڑ گیا۔ اچھا بھلا یہاں بی ایس
سی کر رہا تھا گورنمنٹ کالج میں......اب خاک چھان رہا ہے دوبئی میں۔ کسی
کنسٹرکشن کمپنی میں معمولی سا ملازم ہے''......انہوں نے بمشکل اپنے آنسو ضبط
کیے۔ بڑی بحث کیا کرتا تھا وہ باپ سے کہتا تھا ابو جی اگر آپ اس بے ہودہ
عورت کے بغیر نہیں رہ سکتے تو کہیں چھپ چھپا کر مل لیا کریں۔ آپ کے
یوں کھلے عام اس کے ساتھ رہنے سے ہم کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے۔
بہنوں کی زندگی پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے۔

''تو کیا جواب دیتے تھے اسے''......میں نے پوچھا۔

جواب کیا دیتے۔ کئی کئی دن ادھر آنا ہی چھوڑ دیتے تھے۔ اپنے منشی کو
بھیجتے تھے بس خرچہ دے کر۔ کبھی دل ہوا تو بیٹیوں کو ان کے سکول جا کے مل لیا۔
اس پر میرے بیٹے کی بہنوں سے بھی لڑائی ہوئی اس نے کہا......'' کیوں ملتی ہو
ایسے باپ سے یہ سکول آئیں تو انکار کر دو باہر آنے سے''......''ان دونوں نے
بھائی کی بات نہیں سنی......انہوں نے بے بسی سے بیٹیوں کی طرف دیکھا......

''بس وہ ناراض ہو کر چلا گیا ہے......'' یہ کہتی ہیں وہ آخر ہمارے ابو ہیں ہم انہیں
کیسے چھوڑ دیں۔ بیگم بخاری نے لگاتار بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے
پونچھا۔

''تمہیں اپنے ابو سے بہت محبت ہے۔'' میں نے لڑکیوں سے بہت
پیار سے سوال کیا۔ دونوں خاموش رہیں۔ تب مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ اس
گفتگو کے دوران بھی ایک لفظ نہیں بولی تھیں۔ بس کبھی کبھی معنی خیز نظروں سے

ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''آنٹی تم سے کیا پوچھ رہی ہیں جواب کیوں نہیں دیتیں۔'' بیگم بخاری نے لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ دونوں پھر بھی چپ رہیں۔

''بس جی یہ ابو کی پیاری اور ابو ان کے پیارے ہیں۔ بدنصیب تو میں اور میرا بیٹا ہیں جو بیچارہ دھکے کھا رہا ہے پردیس میں''...... وہ اب باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھیں۔ ''بھابی آپ انصاف کریں وہ ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے کہتا ہے مجھے تو ابو کے پیسے سے روٹی کھاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے''...... ان کی بڑی بیٹی نے اٹھ کر ماں کو پانی کا گلاس لا کر دیا اور ذرا تیز لہجے میں کہا......

''امی اب گھر چلیے بہت دیر ہو گئی ہے۔ ابو بینک سے واپسی پر گھر چکر لگائیں گے ابھی ہمیں یونیفارم اور کتابیں خریدنے بھی جانا ہے''......

''چلتے ہیں ابھی''...... انہوں نے بہت تحمل سے جواب دیا۔ دونوں اٹھ کر باپ کو فون کرنے کے لیے لاؤنج میں چلی گئیں۔

''مجھے ان کی شادی کی بھی بہت فکر ہے۔'' انہوں نے بچیوں کی غیر موجودگی میں مجھ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا...... ''جلدی سے فارغ ہونا چاہتی ہوں اس کام سے۔''

''ابھی پڑھنے دیں انہیں۔ بہت چھوٹی ہیں کم از کم بی اے تو کر لیں''...... میں نے مشورہ دیا......

''بی اے یہ لوگ شادی کے بعد بھی کر سکتی ہیں۔'' کرنل صاحب کی بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا...... ''ابھی گھر میں رشتے موجود ہیں۔ میری سگی بہن اپنے بیٹوں کے لیے کہہ رہی ہیں''......

''کیا کرتے ہیں آپ کے بھانجے۔'' میں نے پوچھا۔

بڑا تو پی آئی اے میں پائلٹ ہے اور چھوٹا کیپٹن ہے آرمی میں، بہت شریف سلجھے ہوئے بچے ہیں دونوں سنجیدہ قسم کے۔ اس زمانے کے تو لگتے ہی نہیں۔ آپ جانتی ہیں میں ان دونوں کو لے کر اکیلی رہتی ہوں۔

ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں آج کل کے حالات سے۔ اب شکر ہے کہ اللہ نے میری بہن کے دل میں نیکی ڈال دی ہے ورنہ ان کے باپ کی بدنامی کی وجہ سے......'' وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بھابی دعا کریں۔ میں تو بس زندہ ہوں کہ انہیں رخصت کر سکوں''...... انہوں نے جاتے جاتے کہا۔

''تم نے اپنی سہیلی کو فون کر لیا''...... میری ساس کی آواز نے مجھے چونکا دیا......

''کیسے آئی تھیں''...... میں نے فون پر نازی سے پوچھا...... آپ کو انوائٹ کرنے اپنے ہاں۔ اس جمعے کو آٹھ بجے آپ کو اور بھائی کو ہمارے گھر ضرور آنا ہے۔ رات کا کھانا ہے''...... نازی نے کہا......

''کیا کوئی خاص تقریب ہے''...... میں نے سوال کیا۔

''بس خاص ہی ہے۔ آ کر دیکھ لیجیے گا''...... نازی نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے مخصوص شرارتی انداز میں کہا اور فون رکھ دیا۔

جمعے کو ہم لوگ شاید 9 بجے کے قریب نازی کے ہاں پہنچے۔ کرنل صاحب سیاہ نئی شیروانی میں ملبوس گیٹ پر کھڑے تھے اور مہمانوں کو ریسیو کر رہے تھے۔ اندر ڈرائنگ روم میں کرنل صاحب کے چند قریبی دوست ان کی بیگمات اور فلمی دنیا کے کچھ نامور ستارے جمع تھے۔ پھولوں سے سجے ہوئے ایک چھپر کھٹ پر کرنل صاحب کی دونوں بیٹیاں گلابی رنگ کے زرتار جوڑوں میں دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ میں دو معمولی شکل وصورت کے ایرانی نوجوان

دولہا بنے لوگوں سے سلامیاں وصول کر رہے تھے اور تشکرم۔ تشکرم' کہتے جاتے تھے مجھے حیران اور حواس باختہ پا کر کرنل صاحب کی بڑی بیٹی نے گھونگھٹ میں سے ہلکا سا اشارہ کر کے مجھے اپنے قریب بلا لیا۔

''آنٹی آپ حیران ہو رہی ہیں ناں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا......

''تم ان لڑکوں کو جانتی ہو'' ......میں نے آہستہ سے سوال کیا۔

''ہاں یہیں مل چکے ہیں ان سے پہلے آنٹی نازی نے ملوایا تھا۔ ان کے کزن ہیں ناں'' ......

''تمہاری امی کہاں ہیں'' ......میں نے بچی سے دریافت کیا......

''دوبئی گئی ہیں ہم لوگوں کا جہیز وغیرہ خریدنے'' ......بچی نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا......

''انہیں پتہ ہے اس معاملے کا'' ......

''نہیں'' ......لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا پھر اچانک اپنا چہرہ اٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت مضبوط لہجے میں بولی...... آنٹی ہم نے امی کو بہت سمجھایا تھا کہ ہم ننھیال میں شادی نہیں کرنا چاہتے۔ پھپھو سنتی ہی نہیں تھیں آپ نہیں جانتی ہیں آنٹی۔ ہمارے کزن کیسے بوروں کے سردار ہیں۔ زندگی والی تو کوئی بات ہی نہیں ان میں۔ بس نبض چل رہی ہے۔ بڑی روحیں۔ ابو کو بھی پسند نہیں وہ لوگ۔ اب دیکھیں ناں یہ لوگ کتنے زندہ دل ہیں۔ کتنے ہنسوڑ کتنے کھلے دل والے۔ خوش رہنا تو کوئی نازی آنٹی کے گھر والوں سے سیکھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہم لوگ ہنی مون کے لیے یورپ جائیں گے۔ ان کا وہاں بھی بزنس ہے۔ بچی نے مسرت بھرے لہجے میں اطلاع دی۔ مگر میرا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر جیسے چپ سی ہوگئی اور دوبارہ سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر بالکل خاموش رہی۔ پھر اس نے اسی طرح

آنکھیں نیچی کیے ہوئے دھیمی آواز میں کہا...... آنٹی اگر امی ابو کی آپس میں بنی نہیں تو اس میں امی کا بھی قصور ہے اب میں آپ کو کیا سمجھاؤں ہماری امی ایک Wet Blanket ہیں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے اس کے آنسوؤں کے ساتھ بہتے ہوئے مسکارے کو ٹشو پیپر سے صاف کیا۔

صلیب

''گڈریوں نے دیکھا اُجالا آدھی رات' کہ چرنی کا بھی چمکا ستارہ آدھی رات' کہ پیدا ہوئے عیسیٰ مسیحا..........

''چپ کریں آنٹی فور گاڈ سیک۔'' میری نے کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر مسز جوزف کو چیختی ہوئی آواز میں ڈانٹا' جو پچھلے آدھ گھنٹے سے یہی گنگنا رہی تھیں۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کی آواز بہت بھونڈی اور بے سری ہے اور دوسری بات یہ نولکھا چرچ نہیں ہے ہمارا گھر ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے آج سنڈے بھی نہیں ہے۔''

اب میری کچن کے اندر آ چکی تھی اور مسز جوزف کے سر پر کھڑی ہو کر چلا رہی تھی۔

''میری میں تو بس'' وہ منہ ہی منہ میں منمنائیں۔ ان کے سفید گھنگھریلے بالوں والا سر خود بخود ہل رہا تھا اور وہ اپنے کانپتے ہوئے سوکھی لکڑی جیسے ہاتھوں سے لوہے کے زنگ آلود پرانے اوون سے بسکٹ کی ٹرے نکال رہی تھی۔ ان کا گہرا سانولا چہرہ اوون کی تپش میں تانبے کی طرح دہک رہا تھا۔

''میری اگر تم مائنڈ نہ کرو تو یہ بسکٹ بیکری پر دے آؤ تیار ہو گئے ہیں۔''

انہوں نے بہت لجاجت سے کہا۔

''اور اگر میں مائنڈ بھی کروں گی تو کیا ہوگا جانا تو میرے ہی کو پڑے گا نا۔'' میری نے چڑ کر جواب دیا۔

''میں خود ہی لے جاتی اگر یہ آتھرائٹس کا درد......'' انہوں نے اپنے سوجے ہوئے گھٹنوں کو دباتے ہوئے پھر منت کی۔

''اور پھر راستے میں سارے بسکٹ گرا کر واپس لے آتی' ٹھیک بول رہی ہوں نا آنٹی۔''

میری نے ان کے لٹکے ہوئے لہجے کی نقل اتاری اور غصے میں اُن کے ہاتھ سے پلاسٹک کا وہ تھیلا کھینچا جس میں وہ بسکٹ بھر رہی تھیں۔

''میری تم تو۔'' مسز جوزف سہم گئیں انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دیں۔

''دیکھو فضل سے کہنا پے منٹ اسی وقت کر دے۔ آٹھ درجن ہیں اور ہاں سنو پیسے مل جائیں تو نثار میڈیکل سٹور سے اپنے انکل کے لیے مارفین کے دو انجکشن بھی لیتی آنا آج بہت Pain ہے انہیں کڈنی میں۔'' مسز جوزف نے میری کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھا۔

''انہیں کڈنی میں کب Pain نہیں ہوتا سارا سال ہی ہوتا رہتا ہے۔'' میری نے طنز کا ایک اور وار کیا۔

''میری خدا سے ڈرو کیسی باتیں کرتی ہو تڑپ رہے ہیں تمہارے انکل درد سے۔'' مسز جوزف اب باقاعدہ گھگھیا رہی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی میڈیکل سٹور پر۔'' میری نے روہانسی ہو کر کہا ''سارے محلے کے بدمعاش لڑکے جمع ہوتے ہیں اس کے سٹور پر' غنڈے کہیں کے' اور نثار خود بھی تو......'' میری کی آواز بھرا گئی' آنٹی اب آپ سے کیا بولوں'

سارے لوگوں کو پتہ ہے انکل کی Morphin Adiction والی بات۔ اتنا مذاق اڑتا ہے میرا۔ جانا تو میرے کو ہی پڑتا ہے نا روز وہاں۔"

"میری بچی تم کوئی غم نہ کرو ایک دن گاڈ ان لوگوں کو Punish کرے گا آج چپی جاؤ بس اب میں تمہارے انکل کو بول دوں گی میری کو وہاں جانا ایک دم پسند نہیں۔"

آج سڑک پر کچھ زیادہ ہی ہنگامہ تھا۔ ایک خربوزے والے نے اپنی ریڑھی عین سڑک کے بیچ لا کر کھڑی کر دی تھی۔ بے کار پھرنے والے نوجوان لڑکوں کا شور مچاتا ہوا اک گروہ اس کے گرد جمع تھا۔ وہ لوگ خربوزوں کے بیج نکال نکال کر ایک دوسرے کے منہ پر مل رہے تھے۔ خوب ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ میری نے ان سے بچ کر گزرنا چاہا مگر لڑکوں نے اسے دیکھ لیا۔ ان میں سے ایک نے بیجوں کا ایک گچھا میری کی طرف اچھالا جو اس کی اسکرٹ کو چھوتا ہوا اس کے جوتوں پر آ کر گرا۔ ایک اور بدتمیز لڑکا بالکل میری کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور میری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گانا شروع کر دیا "پیا ملن کو جانا۔" میری تیزی سے آگے نکلی تو پیچھے سے ایک اور لڑکے نے چوکڑی بھری اور عین اس کے سامنے آ کر سڑک پر الٹا کھڑا ہو گیا "نٹ کا بچہ پیٹ کے لیے روزی کماتا" اس نے مداریوں والی آواز نکال کر میری کی طرف اشارہ کیا۔

میری کی نائلن کی جرابیں جیسے جلنے لگیں۔ اس کے پاؤں میں پسینہ آ گیا تھا۔ وہ جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی بیکری میں داخل ہو گئی یہاں سے تو خیر جلدی خلاصی ہو گئی لیکن اب دوسرا مرحلہ بہت مشکل تھا۔ نثار کی دکان پر جانے کا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی رہی۔ گلی کی نکڑ سے نثار میڈیکل سٹور کا بورڈ صاف نظر آ رہا تھا اور دکان کی شیشے والی کھڑکیوں سے اسے کاؤنٹر پر کھڑا ہوا نثار بھی دکھائی دے گیا

تھا۔ آج وہ بالکل اکیلا تھا شاید سب لڑکے خربوزے والے کے پاس جمع تھے۔ میری نے دکان کے باہر کھڑے ہو کر خواہ مخواہ اپنی اسکرٹ ٹھیک کی اور چہرے سے پسینہ صاف کیا۔ اس کے سر میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نثار نے اسے باہر کھڑے ہوئے دیکھ لیا اور دروازے پر آ گیا۔

"آؤ آؤ میری باہر کیوں کھڑی ہو۔"

میری دکان میں داخل ہوئی۔

"لگتا ہے مسٹر جوزف کو گردے میں پھر درد شروع ہو گیا ہے۔" نثار کے چہرے پر ایک مکروہ سی مسکراہٹ آئی۔

"دوا انجکشن۔" میری نے پسینے میں بھیگا ہوا تڑا مڑا نوٹ نثار کی طرف بڑھایا۔

نثار نے نوٹ پکڑتے ہوئے میری کے ہاتھ کو ذرا سا دبا دیا۔

میری نے فوراً غصے سے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"نسخہ ہے ڈاکٹر کا۔" نثار نے خبیث لہجے میں پوچھا۔

"نسخہ تو نہیں ہے۔" میری نے آہستہ سے جواب دیا۔

"جرم ہے بغیر نسخے کے مارفین بیچنا' جانتی ہو نا تم......" اب پاکستان بن گیا ہے' پہلے والی بات نہیں رہی۔

نثار نے جان بوجھ کر اپنی آواز تیز کی۔ میری نے سر جھکا کر اپنے جوتوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ "میں تو تمہاری وجہ سے یہ غیر قانونی کام کر دیتا ہوں اور تم کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی۔"

اب کی دفعہ اس کی آواز میں شیرینی گھلی ہوئی تھی۔ انجکشن پکڑاتے ہوئے اس نے پھر میری کا ہاتھ دبایا۔

"خیر ہم نے بھی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے دیکھیں کب نکلتی ہے۔" نثار نے

میری کی طرف حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے فلمی انداز میں کہا۔

انجکشن لے کر میری تقریباً دوڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"تمہاری فرینڈ ایڈنا اور اُس کا بھائی آئے تھے پیچھے۔ آنٹی نے اسے اطلاع دی۔"

"مائیکل آیا تھا۔" میری نے خوشی سے پوچھا۔

"ہاں اسے بونس ملا ہے آفس سے تمہیں انوائٹ کرنے آئے تھے شام کو پارٹی دے رہے ہیں اپنے گھر پر۔" مسز جوزف نے پیار سے کہا۔

"آج شام کو۔" میری نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں آج ہی کیوں کیا بات ہے۔ جانا چاہیے تمہیں ہلہ گلہ ہوگا وہاں تمہارا دل بہل جائے گا۔"

"مگر میں پہنوں گی کیا۔" میری نے بے بسی سے مسز جوزف کی طرف دیکھا۔

"اپنا ریڈ پھولوں والا ڈریس اتنا اچھا تو ہے وہ۔" انہوں نے بہت وثوق سے کہا۔

"وہ سڑی ہوئی شکل والا پرانا ڈریس۔" میری کو پھر رونا آ رہا تھا۔

"میں نہیں پہنوں گی وہ۔ وہاں پہلے ہی سب لوگ مجھے لنڈے کی میم....." جملہ پورا کرنے سے پہلے میری کی آواز پوری طرح بھرا گئی تھی۔

"میری بچی اچھا بھلا تو ہے ورنہ کوئی اور دیکھ لو۔"

"میرا کوئی ڈریس اس قابل نہیں ہے۔" میری چیخی۔ آپ ایڈنا کی مسلم فرینڈز کو نہیں جانتیں ہر دفعہ نیا ڈریس پہن کر آتی ہیں Very Expensive اور اتنا شو آف کرتی ہیں دوسرے کو تو بس Cheapster کہہ دیتی ہیں۔" میری

نے ایڈنا کی مسلم فرینڈز کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے لفظ Cheapster پر زور دیا۔ اب وہ زار و قطار رو رہی تھی اور اس کے منہ سے آدھے ادھورے جملے نکل رہے تھے۔

"آپ کو کچھ پتہ نہیں آپ کچھ نہیں جانتیں کتنی اوچھی اور چھچھوری ہوتی ہیں مسلم گرلز۔ آپ کہتی ہیں ریڈ والا ڈریس پہن لوں۔ پہچان لیتی ہیں وہ Clever لڑکیاں کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا' گھٹیا چھوکریاں I Hate them۔

"نہ نہ میری ایسا مت بولو۔ گالی نہیں دیتے کسی کو۔ تم اپنا دل کیوں برا کرتی ہو۔ گاڈ ان لوگوں کو ضرور Punish..... مسز جوزف نے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"گاڈ ان لوگوں کو کبھی Punish نہیں کرے گا۔ مجھے پتہ ہے گاڈ تو سارے وقت سویا رہتا ہے۔" میری نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میری پارٹی کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والی تھی کہ جب میڈیکل سٹور والا نثار پھلوں کے لفافوں سے لدا پھندا صحن میں داخل ہوا۔

"کیسے ہیں مسٹر جوزف۔" اس نے سرسری طور پر آنٹی سے پوچھا اور سیدھا مسٹر جوزف کے کمرے میں چلا گیا۔

"میری ذرا رکنا۔" مسٹر جوزف کے کمرے سے آواز آئی۔

"انکل جوزف میں ایڈنا کی پارٹی سے لیٹ ہو رہی ہوں۔"

"بس ایک منٹ کو۔" مسٹر جوزف نے پھر آواز دی۔ میری بھاگتی ہوئی ان کے کمرے میں پہنچی۔ مسٹر جوزف نثار کے لائے ہوئے انگور کھا رہے تھے اور بہت ہشاش بشاش دکھائی دیتے تھے۔

''ارے میری بیٹا سنو! مسٹر نثار بولتے ہیں برٹ انسٹی ٹیوٹ میں ایک بہت بڑی Exhibition لگی ہوئی ہے تم جاؤ نا دیکھ آؤ ان کے ساتھ۔''

''انکل میں مائیکل اور ایڈنا کی پارٹی میں جا رہی ہوں۔'' اس نے احتجاج کیا۔

''میرے سامنے زبان چلاتی ہے چھوکری۔ تھوڑا خیال کر۔ ارے تیرے پیرنٹس کی Death پر ہم نے تجھے پالا نہ ہوتا تو سڑکوں پر بھیک مانگتی اور وہ آوارہ گھٹیا چھوکرا مائیکل جو دو سال سے ٹائپسٹ کی نوکری کر رہا ہے تین سو روپے تنخواہ ہے اور خواب دیکھتا ہے تم سے شادی کرنے کے۔'' مسٹر جوزف نے پوری طاقت سے گرج کر کہا۔

''مائیکل بہت شریف لڑکا ہے انکل۔'' رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اونچی آواز میں جواب دیتے ہوئے میری کی آواز پھٹ گئی۔

''جانے دیں مسٹر جوزف۔'' نثار نے بہت معتبر بن کر کہا۔ ''نمائش تو بہت لیٹ چلتی ہے میری پارٹی سے فارغ ہو جائے تو پھر چلے جائیں گے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہ وہاں سے کچھ اچھے بیڈ کور اور تولیے آپ لوگوں کے لیے خرید لے گی یا جو بھی چیز آپ بتاتے۔'' نثار نے مسکرا کر میری کی طرف دیکھا۔

''تھینک یو تھینک یو مسٹر نثار۔'' آپ میری کو اُدھر ہی سے پک کر لیں اور دیکھو میری میں کوئی بہانہ نہ سنوں۔ ابھی ابھی تم خود آنٹی سے جھگڑ رہی تھیں کہ تمہارے پاس نئے ڈریس نہیں ہیں وہ بھی پسند کر لینا اپنے لیے میں تو تمہارا ہی بھلا سوچتا ہوں میرا کیا فائدہ ہے۔'' مسٹر جوزف کا لہجہ اب ذرا ملائمت لیے ہوئے تھا۔

(پچاس کی دہائی کے تناظر میں لکھا گیا۔)